جو تنہا کر گئی مجھ کو
سہیل پرواز

جو تنہا کر گئی مجھ کو

۳۹ سالہ خوبصورت رفاقت کی حسین یادوں پر
مبنی سچی اور دلگداز داستان

سہیل پرواز

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جو تنہا کر گئی مجھ کو

سوموار، ۲ فروری ۲۰۱۵ء
بوقت رات دس بجکر ترپن منٹ
اسلام آباد

910.4 Parwaz, Sohail
Jo Tanha Kar Gai Mujh Ko/ Sohail Parwaz.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2017.
160pp.
1. Biography. I. Title.

2017ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-3058-6
ISBN-13: 978-969-35-3058-2

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

ننھی حزل آ سُہیل کے نام جو

اپنی دادی کی رخصتی کے بعد دنیا میں آئی اور

یوں اس کا ذکر اس کتاب میں ہونے سے رہ گیا

فہرست

رفاقتوں کا سفر

عیداں تے شبراتاں آئیاں
سارے لوکی گھراں نوں آئے

کتاب میرے سامنے لیپ ٹاپ کی آغوش میں حرف حرف بکھری پڑی ہے۔ اسے ایک مرتبہ پڑھا لیکن حواس نے ایک غم آلود کہرے کی چادر تان لی۔ میں نے اپنے بیحد محترم دوست سہیل پرواز کو بتایا کہ اس پر کچھ تحریر کرنا میرے بس کا روگ نہیں۔ شاید اس وقت میں ان ہی دلگداز لمحات کی زد میں کھڑی ہوں جب میری ماں نے میری دید کی تمنا اپنی آنکھوں میں لیے حسرت سے آنکھیں موند لی تھیں یا پھر شاید مستقبل کے اس امکانی لمحے کی وحشت کو سوچ کر قلم لرزیدہ ہے جب ایک دن خود مجھے بھی ماں کی صورت اپنے بیٹے کے کاندھے پر جانا ہوگا؟ لیکن نہیں دوستانہ رفاقت کا یہ تقاضا مجھے پورا کرنا ہی ہے۔ دو ہفتوں میں اس تحریر کو میں نے کئی بار پڑھنے کی کوشش کی اور پھر اس کتاب پر اپنے شکستہ حروف، متزلزل خیال کو اور لب بستہ فکر کو اذن تکلم دیا۔ یہ گنگناہٹوں اور آہٹوں سے چھلکتی کتاب صرف عام سے گھر کی عام سی کہانی نہیں بلکہ یہ دو تہذیبوں کا مقامِ اتصال بھی ہے۔ نصف صدی پرانی معاشرت جہاں رابطوں میں سرعت تو نہیں لیکن قلبی گہرائی ضرور ہے۔ دل و ذہن کی وحدت سے جو الفاظ قرطاس پر بکھرتے ہیں دلربا ہاتھوں کے لمس سے وہ الفاظ زندہ ہو جاتے ہیں، ہنستے ہیں، بولتے

ہیں، شکوہ کناں ہوتے ہیں اور کاغذ کو اشکوں سے بھگونے پر بھی قادر ہیں۔

یہ کتاب نہیں بلکہ احساسِ محرومی سہتے، ابدی مفارقت کی گلیوں سے نشانِ ماضی ڈھونڈتے اور رفاقتوں کی مہک کو مٹھیوں میں بند کرتے ایک حساس فنکار کے احساسات کی عکس بندی ہے۔ قاری بھی مصنف کے ہمقدم ان ہی گلیوں کوچوں سے گذرتا ہے۔ اس کی خوشی کے لمحات سے دل میں طمانیت محسوس کرتا ہے اور غم کی کیفیات بھی خود پر گذرتے دیکھتا ہے۔

حسِ ظرافت، اپنے ردِ عمل کا تجزیہ، پھر غلطی کو مان لینا اور صلح کی پہل میں خود کو معتبر سمجھنا، گئے دنوں کی رنجشوں کو یوں بھلا دینا جیسے دلوں میں کبھی دراڑیں پڑی ہی نہیں تھیں، یہی انداز رشتوں کے بندھن کو ہر روز استحکام بخشتا ہے۔

ازدواجیات ایک ایسا موضوع ہے جس پر سنجیدہ اور غیر سنجیدہ انداز میں زمانہِ قدیم سے نجانے کیا کیا لکھا جا چکا ہے۔ سقراط کا مؤقف ہے کہ،

''شادی ہر صورت میں کرنی چاہیئے۔ اگر آپکو اچھی بیوی مل جائے تو شادمانی راس آئیگی اور اگر بری بیوی مل گئی تو آپ بہرحال فلسفی تو بن ہی جائیں گے''۔

انگریز اسے عمر قید کہنے سے بھی نہیں چوکتے،

Marriage:Sometimes soulmates, sometimes cellmates

رشتوں کے تقدس کا ذکر احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اپنی نانی جان سے لیکر اپنے قانونی والد اور خوشدامن کا تذکرہ ایک سدابہار رُت کی طرح ہے۔ بلاشبہ سہیل پرواز اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے ہیں کہ نئی نسل محبت کے طلسماتی لفظ سے شروع ہوتی اس طویل داستان کے تمام ابواب بغور پڑھے تاکہ زندگی میں رفاقتوں کا سفر اختیار کریں تو راستے کے خطرناک موڑ، گھاٹیاں، نشیبی کٹاؤ اور کٹھن چڑھائی میں بھی ایک دوسرے کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے مزید مضبوطی سے تھاما جائے۔

سہیل پرواز نے صرف اپنے شوہرانہ فرائض کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ رخسانہ کے حسین وجود کے ساتھ اس کی دلفریب شخصیت کا اعتراف بھی کیا ہے جو بیحد معصومیت اور دیانت داری سے اقرار کرتی ہے کہ اسے کھانا پکانا نہیں آتا۔ ہمارے معاشرے کے کوچہ و بازار میں کئی ایسی چیختی چلاتی داستانیں نقاب اوڑھے پھرتی ہیں، جہاں کھانے میں نمک کم یا زیادہ ہونے پر بیوی کے منہ پر رکابیاں مارنے والے موذی پلتے ہیں۔ وقت پر کھانا تیار نہ ملنے پر ہاتھ جلانے کی سزائیں اور کھانے میں لذت نہ ہونے پر بیوی کی پچھلی سات پشتوں تک کو ''خراجِ عقیدت'' پیش کرنے والے سورما بھی یہیں کہیں ہمارے درمیان پائے جاتے ہیں۔ ایسے میں یہ تخلیق ان تمام اذہان کیلئے مینارۂ نور ہے جنہیں اپنے گھروں سے ایسے مثالی نمونے نہیں ملے۔ استعارات کی زبان میں اپنی زندگی کو تہہ و بالا کرنے والے مہیب طوفان کو ''نائن الیون'' سے تشبیہ دی گئی ہے جس نے انتالیس سالہ رفاقت کی فلک بوس عمارت کو خس و خاشاک میں بدل ڈالا۔

مصنف نے صرف بطور شوہر ہی اپنا کردار نہیں نبھایا بلکہ بطور ایک بیٹے کے اپنی والدہ کے حکم کی آبرو بھی رکھی۔ بطور والد یہ احساس پنپتا رہا کہ اس مختصر حیات کا اولین فرض دنیا کو بہترین نسل دینا ہے۔ اولاد کی تربیت صرف ماں ہی کی ذمہ داری نہیں بلکہ ایک مثالی باپ قدم قدم پر اپنی رفیقۂ حیات کے انداز تربیت کو نہ صرف سراہتا ہے بلکہ شفقت کی قوسِ قزح بھی پھیلائے رکھتا ہے۔

اس کتاب میں زندگی اپنے ہفت رنگوں کی قبا اوڑھے ملتی ہے۔ سرخ سبز دوشالے بھی ہیں۔ مسرتوں کا لہراتا آنچل بھی اور ایک ابدی جدائی کے سفید کفن میں لپٹا درد کا سیاہ بدن بھی۔ مٹی اوڑھ کر سوتا ایک بے پناہ رشتہ جسے فخر حاصل ہوا کہ وہ اپنے محبوب شوہر اور اپنے بیٹوں کے کاندھوں پر اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچے۔

زندگی کی کامرانیاں اور شادکامیاں ہی نہیں اپنی زندگی کی ناکامیاں بھی قاری کو سنائی

گئی ہیں۔ گر کر اٹھنے اور زیست سے دوبارہ نئے عزم کے ساتھ پنجہ آزمائی کی جھلک بھی دکھلائی گئی ہے۔

کسی بھی باپ کیلئے اپنی اولاد بالخصوص بیٹی کا دکھ جھیلنا آگ کے دریا سے گذرنے کے مصداق ہے۔ یہ کتاب وہ جانگداز لمحے بھی ایک تصویر کیطرح سامنے پیش کر دیتی ہے جب اپنے جگر گوشے کے سر سے سہاگ کی چادر اترنے کی خبر آتی ہے۔ زندگی صبر کے جام سے مسلسل گھونٹ بھرنے کا نام ہے۔ صرف خود کسی کے دل میں اپنا مقام دیکھنے کی بیمار خواہش نہیں بلکہ اپنے دل کے محل کے داخلی دروازے پر کسی کے نام کی تختی لگا دینے کا حوصلہ بھی شامل ہے۔

دیباچہ لکھنا یا کسی بھی کتاب کو تنقیدی اور تعریفی نظر سے دیکھنا نہ تو میرا منصب ہے اور نہ ہی معمول لیکن یہ کتاب جس کا ایک ایک لفظ ''از دل خیزد و بردل ریزد'' ہے شاید میری اپنی کتاب ہے۔ مجھے فخر ہے کہ بحیثیت ایک ادبی دوست کے میں نے رخسانہ سہیل سے فون پر بات چیت کی۔ سہیل پرواز کے علمی و ادبی ذوق اور بیحد متحرک حسِ ظرافت سے ہم محظوظ ہوئے۔ کئی مرتبہ ادبِ لطیف کے نام پر الٹے سیدھے فی البدیہہ ٹپے ماہیے ایک دوسرے کو لکھتے اور سہیل پرواز کہتے ''صدف ذرا رکو، یہ ٹپہ میں رخسانہ کو بھی سنالوں''۔ ایک ہنستا مسکراتا احساس کہ اس دنیا میں ایسے جوڑے بھی ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھی اور دوست بھی ہیں بہت نادر ہے۔

پھر میں نے رخسانہ کو راستہ بدل کر بے بسی سے ان رشتوں کو چھوڑ کر جاتے دیکھا جن کے ایک آنسو پر اس کی مامتا ننگے پاؤں صحرا میں چلنے کو تیار تھی لیکن خاموشی سے انکی اشک آلود آنکھوں سے آنکھیں چراتے ہوئے اپنے ابدی ٹھکانے پر جا پہنچی۔

عیداں تے شبراتاں آئیاں
سارے لوکی گھراں نوں آئے

او نئیں آئے محمد بخشا

جیہڑے آپ ہتھیں دفنائے

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب جس کے ہاتھ کو چھوئے گی اور جس کی نظر سے گذرے گی اسے ایک دفعہ اپنی ماں کا چہرہ ضرور دکھائی دے گا،سو دست دعا بلند کرنا ایک خود اختیاری عمل نہیں رہتا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

صدف مرزا

محقق،مصنفہ،شاعرہ

کوپن ہیگن،ڈنمارک

تا حیات، شریکِ حیات

میجر سُہیل پرواز کی تازہ تصنیف کا موضوع اور اسلوب ذاتی ہیں۔ لکھاری کیلئے اپنی ذاتی زندگی کو ذات کے حصار سے باہر نکال کر عام کرنا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے جبکہ ''عام'' کو ذات کے دائرہ میں محدود کرنا قدرے آسان ہے۔

سہیل پرواز نے اپنی رفیقہِ حیات کے بعد از وفات ذکر کو منفرد انداز میں بیان کرتے ہوئے مرحومہ کو تا حیات شریکِ حیات کا مرتبہ عطا کیا ہے اور یہ کیفیت کتاب کے ہر جملے میں کوندر ہی ہے۔ اکثر صفحات بے لوث محبت اور انمٹ کشش کے واقعات سے اسطرح چکاچوند ہیں کہ پڑھنے والے کی آنکھیں رشک سے چندھیا جاتی ہیں۔ سہیل پرواز اور رخسانہ بھابھی کی پریم کہانی کا چشمہ پوٹھوہار کی ناہموار سرزمین کی عطا ہے۔ یہ بے آب و گیاہ اور سرسبز پہاڑوں اور وادیوں کے حسین امتزاج کا علاقہ ہے، جہاں پانی کے چشمے زندگی کی نوید سناتے ہیں۔ سہیل کے نزدیک رخسانہ بھابھی کے وجود سے ہی زندگی کی تکمیل تھی۔ فرماں بردار بیٹے نے اپنی والدہ محترمہ کو حالِ دل سنایا اور اس امید کے ساتھ کہ اب مشفق ماں دوا اور دعا کے ساتھ بیمارِ محبت کا علاج کریں گی۔ یہ مرحلہ ابھی جاری تھا کہ سہیل پرواز فوجی تربیت کے لیے پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول پہنچ گئے۔ زندگی کے اس کٹھن ترین مقام پر محبت کے چشمے کی پھوار نے انہیں تازہ دم اور پر امید رکھا۔ پی ایم اے کا تربیت یافتہ لفٹین جب راولپنڈی واپس

پہنچا تو دعا اور دوا دونوں اپنا اثر دکھا چکی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول میں سہیل پرواز اور میں ہمراہی تھے۔ ہمارا کورس (بیچ) ایک ہی تھا تاہم پلاٹونیں مختلف تھیں، البتہ آؤٹ ڈور مشقوں وغیرہ پر سامنا ہوتا رہتا تھا۔ پی ایم اے میں جب کٹھن تربیت کا سورج سوا نیزے پر آتا ہے تو تقریباً ہر کیڈٹ کے ہونٹ شدتِ کرب سے کانپ رہے ہوتے ہیں اور اپنے اپنے اہداف کیلئے ورد جاری ہو جاتا ہے۔ سہیل کی کتاب کا مسودہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ خود کو چوکس، توانا اور ہر دم تیار و کامران رکھنے کیلئے اس نے ایک ہی نام کو ''وردِ جان'' بنائے رکھا۔ جب ''ربطِ باہمی'' کا یہ عالم ہو تو منزل آسان سے آسان تر ہو جاتی ہے۔ کتاب میں قدم قدم پر سہیل پرواز اور رخسانہ بھابھی یک جان دو قالب نظر آتے ہیں بلکہ دو چار مقامات تو ایسے بھی ہیں جہاں سہیل کا یکجان قلم دو قالب کے تصور کی بھرپور نفی کرتا ہے۔

پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول کے بعد سہیل پرواز سے دوبارہ سامنا آئی ایس پی آر ڈائریکٹوریٹ میں ہوا۔ میں کوئٹہ لاہور اور کراچی میں آئی ایس پی آر کے وجود کا احساس دلانے کے بعد واپس راولپنڈی پوسٹ ہوا تھا۔ ہم دونوں کو فوجی ملازمت میں بیس برس سے زائد کا عرصہ گذر چکا تھا۔ اتفاق سے راولپنڈی چھاؤنی میں کاب لائنز کے علاقے میں رہائش الاٹ ہوئی جہاں چار سرکاری گھر چھوڑ کر سُہیل پرواز کا ''آستانہ'' تھا۔ ہم دونوں کو کارِ سرکار میں کسی اور شے کی ہوش نہیں تھی۔ بچے شاید ایک ہی سکول بس میں سفر کرتے تھے یوں بیگمات میں بھی دعا سلام ہو گئی۔ آفس سے سرِ شام یا رات گئے واپسی ہوتی تو معمول کی گفتگو کے بعد جس روز فیملی کے حقوق و فرائض پر رسیلے جملے کان سے ٹکراتے تو اندازہ ہو جاتا کہ آج بیگمات کے مابین ڈی بریفنگ سیشن ہوا ہے۔ رخسانہ بھابھی کی سخن دلنواز اور خاندانی امور پر عملی مشاورت کی میری اہلیہ مداح تھیں۔ غالباً دونوں فیملیز کا کوئی دو برس ساتھ رہا، پھر میں دوبارہ کراچی چلا گیا اور یوں بات چیت صرف ٹیلیفون تک محدود ہو گئی۔

میجر سُہیل پرواز نے اپنی کتاب کے ذریعے میرے ایسے متعدد دوستوں اور احباب کو گذرے ہوئے خوشگوار ایام کی یاد دلا دی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آغاز سے ہی یہ المناک احساس قاری کو مغموم کئے رکھتا ہے کہ مصنف کے قلم کا محور و مرکز، حیات نہیں ہے۔ مصنف نے اپنے ذاتی جذبات کو منفرد انداز میں اجتماعی کیفیت عطا کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب وفادار شوہر کی حیثیت سے عسکری افسران کا گراف مزید اونچا کر یگی، جو کٹھن فرائض کی انجام دہی کے دوران بھی اپنے خاندان کی یادیں دل سے محو نہیں ہونے دیتے۔ رخسانہ بھابھی کی صورت مثالی اہلیہ اور رفیقِ سفر کی سی ہے جو کتاب میں نمایاں ہے۔ مرحومہ اپنے قابلِ تقلید رویئے سے شوہر اور بچوں کی دیکھ بھال میں اپنے آرام تک کا خیال نہیں رکھتیں۔ ایسے لمحات میں بھی کہ جب وقتِ آخر قریب ہے تو بہو کی سالگرہ کی تقریب کو ہسپتال میں داخلے پر ترجیح دیتی ہیں۔

سُہیل پرواز کی کتاب ایک شوہر کے تابناک قلم سے مرحومہ بیوی کی شخصیت کی قابل رشک قلمی رونمائی ہے جو مدتوں تک اس محبت بھری رفاقت کی داستان کی خوشبوئیں بکھیرتی رہے گی۔

بریگیڈئر (ر) صولت رضا

مصنف، مزاح نگار

☆ ☆ ☆

جو تنہا کر گئی مجھ کو

۱۰ ستمبر ۲۰۱۴ء کو میری عزیز از جان رفیقہِ حیات رُخسانہ ہسپتال کے بستر پر اپنی آخری سانسیں گن رہی تھی اور میں اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ بخوبی جانتا تھا کہ ہماری ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا لیکن کسی سے بھی کہنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ ایسے میں ایک خیال بے اختیار ذہن میں اُبھرا، ''وہ جس نے ساتھ دینا تھا لو تنہا کر گئی مجھ کو'' اور نقش ہو کر رہ گیا۔ قیامت آئی اور گزر گئی۔ بہت دنوں تک ہمت نہ کر پایا کہ اس خیال کو اپنے جذبات کا روپ دوں لیکن بالآخر میری تنہائی نے میری مدد کی اور میں نے کوشش کر ڈالی۔

فسردہ کر گئی مجھ کو، شکستہ کر گئی مجھ کو
کہ جس نے ساتھ دینا تھا، وہ تنہا کر گئی مجھ کو
بدلتے موسموں کا سحر رکھتا ہے مجھے مسحور
خزاں کی زرد رُت کا سرد لحہ کر گئی مجھ کو
ہمیں تو ساتھ چلنا تھا، ہمیں وعدہ نبھانا تھا
جھٹک کر وہ قبائے جان، دریدہ کر گئی مجھ کو۔
طویل اک ساتھ ٹوٹے تو جہاں دل اُجڑتا ہے

چُھڑا کر ہاتھ وہ پل میں، تماشہ کر گئی مجھ کو

وہ جس آنگن میں رہتی تھی کبھی چہکار سی اس کی

اُسی آنگن کا وہ تنہا پرندہ کر گئی مجھ کو

خزینہ جس کی الفت کا سدا شاداب رکھتا تھا

وہ آنکھیں موند کر یکدم خرابہ کر گئی مجھ کو۔

ٹھٹھرتی سرد راتوں میں، جو میرے دل میں بستی تھی

بچھڑ کر موسم گل میں، وہ جاڑا کر گئی مجھ کو

فسردہ کر گئی مجھ کو، شکستہ کر گئی مجھ کو

کہ جس نے ساتھ دینا تھا وہ تنہا کر گئی مجھ کو

سہیل پرواز

☆ ☆ ☆

چھڑا کر ہاتھ، وہ پل میں

روایت ہے کہ اولاد، انسان کے لئے اللہ کی نعمت بھی ہے اور آزمائش بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ والدین اس آزمائش میں تمام عمر مبتلا رہتے ہیں ہاں البتہ یہ اعزاز فقط ماں کو حاصل ہے کہ اس آزمائش کے پہلے اور کٹھن زینے پر وہ ہی قدم رکھتی ہے۔ ایک انجانی ننھی جان، نو ماہ، ماں کی کوکھ میں بسیرا کرنے کے بعد جب ایک نئی دنیا کا سفر اختیار کرتی ہے تو اولین اور کڑے امتحان کے لئے قادر مطلق والدین میں سے ماں ہی کو منتخب کرتا ہے۔ اور اس کا صلہ رب ذوالجلال نے اُسے، اسکے قدموں میں جنت کی صورت میں عطا کیا ہے۔ اگر کوئی ماں اس جاں گسل آزمائش میں کامیاب ہونے کے بعد ایک ننھی جان کو آغوش میں بھرنے کے لئے جانبر ہوتی ہے تو کوئی ایسی حرماں نصیب بھی ہوتی ہے جسے اپنی کوکھ میں پلنے والی ننھی اور معصوم روح کو اس دُنیا میں آمد کا اجازت نامہ عطا ہونے پر نہ چاہتے ہوئے بھی مشیت ایزدی سے پروانۂ اجل وصول کرنا پڑتا ہے۔

تمام عمر اولاد کی تربیت کے لئے انھیں ناز و نعم سے پالنے کے لئے والدین کیا کیا جتن نہیں کرتے۔ لیکن اولاد پھر بھی رب العالمین کی امانت ہی ٹھہرتی ہے۔ ایسی ہی چند امانتیں رب العزت نے اس گنہ گار کو بھی سونپی ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ امانتیں بھی خالق و مالک ہی کی ہیں اور ان امانتوں کی حفاظت کے لئے یہ کمزور اور ناتواں شخص ہمہ وقت ہاتھ اُٹھا کر انھیں اپنی

امان میں رکھنے کی دُعا بھی اُسی سے مانگتا ہے۔

پروردگار عالم نے مجھے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا ہے۔ بڑا بیٹا دوسرے اور چھوٹا بیٹا آخری نمبر پر ہے۔ دونوں بھائیوں میں پورے آٹھ سال کا فرق ہے۔ حسن اتفاق کہ بڑے کی تاریخ پیدائش گیارہ ستمبر جبکہ چھوٹے کی دس ستمبر ہے۔ دونوں ہر سال اپنی اپنی سالگرہ پر اپنی پیاری ماں سے کوئی نہ کوئی تحفہ لیا کرتے تھے۔ لیکن بے خبر بیٹوں کو قطعی علم نہیں تھا کہ سن دو ہزار چودہ میں دونوں کے جنم دن پر انکی ماں، دونوں کو انکی سوچ اور وہم و گمان سے بھی باہر کا ایک چونکا دینے والا تحفہ دینے والی ہے۔

میرے بچوں کی ماں اور میری محبوب رفیقہ حیات رُخسانہ کی اور میری رفاقت کم و بیش انتالیس سال رہی۔ میری آزمائشوں، مشکلات، مالی پریشانیوں و تفکرات اور موسموں کے تغیر میں رُخسانہ کا وجود میرے لئے اللہ کا عطا کردہ وہ سہارا تھا جس نے مجھے زمانے کے تند و تیز طوفانوں کے بے رحم تھپیڑوں کے سامنے کھڑا رہنے کا حوصلہ دیا۔ رُخسانہ کا ساتھ میرے لئے اس ریپڈ چارجر (Rapid Charger) کی مانند تھا جو موبائل فون کی بیٹری کو چند ہی منٹوں میں مکمل طور پر توانا کر دیتا ہے۔ مجھے کسی مصیبت، الجھن یا پریشانی کا سامنا ہوتا تو رُخسانہ کا میرے پاس موجود ہونا ہی کافی ہوتا اور میری ہمت بڑھانے کا سبب بنتا۔

میری یہ کتاب صرف ہماری انتالیس سالہ رفاقت کی یادداشتوں پر ہی مشتمل نہیں بلکہ میری عمر کے لوگوں کو اس میں اپنی خوبصورت رفاقت کا عکس بھی نظر آئے گا اور جوان نو بیاہتا جوڑوں کو اپنے رفیق زندگی کی قدر کے حوالے سے اہم سبق اور رہنمائی بھی ملے گی۔ فی زمانہ جبکہ مغرب کی تقلید میں اندھے ہو کر ازدواجی زندگی کو محض ایک کھیل اور مذاق بنا کر رکھ دیا گیا ہے، مجھے اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی کہ جوان نسل کو نہ صرف عمیق گڑھوں میں گرنے سے بچایا جائے بلکہ انہیں ''رفیق زندگی'' جیسی خوبصورت رفاقت کی اہمیت سے بھی آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اپنی نجی زندگی کے ان پوشیدہ

گوشوں پر سے پردہ اُٹھانے کی جرأت کی ہے جنہیں کوئی بھی لکھاری اپنے قاری سے شیئر کرنے سے کتراتا ہے مگر میں اس مقدس اور پاک بندھن کی حساسیت اور اہمیت کا احساس دلانے کے لئے رائج الوقت روایت سے بغاوت کرر ہا ہوں۔

ہمارے والدین اور دیگر بزرگ وقتاً فوقتاً ہمیں شوہر اور بیوی کے مقدس رشتے کی بیک وقت نزاکت اور مضبوطی سے آگاہ کرتے رہا کرتے تھے۔اور یہی وجہ تھی کہ باوجود معمولی تلخیوں اور شکر رنجیوں کے ہماری چھوٹی موٹی خوبصورت جھڑپیں اور بسا اوقات بڑی لڑائیاں نہایت مختصر عرصہ کے بعد ایک شاندار صلح پر منتج ہوتی تھیں۔اکثر وہ صلح اتنی جاندار اور رومان پرور ہوتی کہ کچھ ہی عرصہ بعد دوبارہ کوئی چھوٹی موٹی ''سرحدی جھڑپ'' کرنے کو دل چاہتا لیکن صرف اس صلح کی لذت سے لطف اندوز ہونے کے لئے ،مگر نوبت خدانخواستہ کبھی گھر چھوڑنے یا گھر سے نکالنے کی دھمکی دینے تک نہیں پہنچتی تھی۔لیکن آج کل اکثر شادیوں کے ہولناک انجام دیکھ کر میں کانپ کر رہ جاتا ہوں۔

کچھ ہی عرصہ پہلے ایک شناسا کی بچی کی رخصتی ہوئی۔سب کو معلوم تھا کہ یہ محبت کی شادی تھی جس کے لئے ایک مہذب لفظ ''پسند کی شادی'' استعمال کیا جاتا ہے۔کوئی دو تین ماہ بعد بچی کے والد سے ملاقات ہوئی تو میں نے اخلاقاً بچی کی خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ خوش ہے،تو حضرت نے نہایت لاتعلقی سے کورے لہجہ میں فرمایا کہ ''نہیں جناب،لڑکی کو ان کے گھر کا ماحول پسند نہیں آیا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بیٹی ذہنی اذیت کا شکار رہے،سو اُسے کہا کہ طلاق لے کر آجائے۔لڑکوں کی کمی نہیں'' اور میں نہایت حیرت سے دُنیا کے اس منفرد باپ کا جذبات سے عاری چہرہ تک رہا تھا جس نے اپنی بیٹی کا گھر بسانے کے بجائے اُسے اُجاڑنے میں اس کی اعانت کی۔

روزمرہ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات علم میں آتے ہیں۔کہ لڑکیاں خلع مانگ لیتی ہیں۔لڑکے طلاق دینے میں دیر نہیں کرتے۔شادیاں پسند کی ہوتی ہیں لیکن کچھ ہی عرصہ بعد

کوئی ایک ساتھی یا دونوں کسی نئے دامِ الفت میں گرفتار ہو کر ٹائم پاس معاشقہ چلا لیتے ہیں۔اور بعض اوقات تو دونوں میں سے کوئی ایک، دوسرے ساتھی کی جان تک لینے پر بھی تل جاتا ہے اور قیامت تب ڈھے جاتی ہے جب دونوں کی مختصر محبت کا شاخسانہ ایک آدھ معصوم، اس دنیا میں در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے پیچھے رہ جاتا ہے۔مغرب کی بے مہار تہذیب نے جوان نسل کو عمومی طور پر اس قدر بے لگام کر دیا ہے کہ اب انہیں اکھٹے رہنے (living together) کا فلسفہ بھی بھاتا ہے۔اگر کہیں مرد اخلاق سے عاری ہو کر شادی شدہ عورتوں کو سنہرے خواب دکھا کر دام الفت میں گھیرتے ہیں تو جا بجا حیا سے عاری ایسی ڈائینیں بھی نظر آئیں گی جو اپنی ہی صنف کے گھر اجاڑنے سے دریغ نہیں کرتیں۔بے صبری اتنی کہ شادی کے مثبت آثار ظاہر ہونے پر ہی "تعلق" قائم کر لئے جاتے ہیں مگر نہ تو اس میں عار سمجھی جاتی ہے اور نہ ہی اس بات کا احساس کیا جاتا ہے کہ معاشرے کے ساتھ ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مجرم بھی بن رہے ہیں۔اکثر "آزمائشی عرصہ" میں ہی ایک دوسرے کو خیر باد کہہ دیا جاتا ہے۔اور دونوں ساتھی اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔

اس بے راہ روی میں موبائل فون کلچر نے تو اہم رول ادا کیا ہی کیا ہے لیکن سچ پوچھیں تو اس میں ہم والدین کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے اولاد سے دوری اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔اپنی ذمہ داریوں سے لاتعلق ہو کر فرض کر لیتے ہیں کہ بچے محفوظ ہیں اور سب اچھا ہے۔ہم آج کے والدین، اپنے بزرگوں کے برعکس اپنی ذمہ داریاں اور فرائض نبھانے میں کافی حد تک ناکام رہے ہیں جس کا خمیازہ ہمیں معاشرتی پریشانیوں اور الجھنوں کی صورت میں بھگتنا پڑ رہا ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ سارا معاشرہ ہی اسی ڈگر پر چل پڑا ہے۔ابھی بھی رسم و رواج، اخلاقی اور مذہبی اقدار کا پاس رکھنے والے اور بچوں کو اچھے برے کی تمیز سکھلانے والے ماں باپ موجود ہیں اور یہ وہ والدین ہیں جو اس مقولے پر یقین رکھتے ہیں کہ کھلاؤ سونے کا نوالہ لیکن آنکھ شیر کی رکھو۔اور اللہ نے اس کا انعام انہیں ایسی فرمانبردار اولاد

کی صورت میں عطا کیا ہے جن کی آنکھوں میں حیا ہے اور جو ماں باپ کی قدر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے رفیق زندگی سے بھی محبت کرتے ہیں۔

سچ پوچھئے تو انتالیس سال میں ایک مرتبہ اور ایک لمحے کو بھی میرے دل میں اس وسوسے نے گھر نہیں کیا تھا کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک یوں دفعتاً اور غیر اعلانیہ اچانک دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جائیگا۔ اور چونکہ ایسا کبھی سوچا نہیں تھا سو ذہن میں کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ جو تنہا رہ جائیگا وہ کیسا محسوس کریگا۔ رخسانہ اکثر کہا کرتی تھی کہ میری دُعا ہے کہ مجھے آپ کے ہاتھوں میں موت آئے اور میں کبھی اس کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ کبھی ہنس کر ٹال دیتا تو کبھی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا لیکن اب جب کہ وہ چلی گئی ہے تو مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا ہے کہ میں کتنا تنہا، مفلس اور قلاش ہوں ۔

طویل اک سانجھ ٹوٹے تو جہانِ دل اجڑ تا ہے
چُھڑا کر ہاتھ وہ پل میں تماشہ کر گئی مجھ کو

واقعی عشروں کی رفاقت انسان کو ایک دوسرے کا عادی بنا دیتی ہے اور اگر وہ دو انسان رفیق سفر ہوں تو اس رفاقت کی شدت کا اندازہ آپ خود کر لیجئے۔ میں اجل کے اس مذاق پر ابھی تک سکتے سے باہر نہیں آسکا اور نہیں معلوم کہ اس زخم کو مندمل ہونے میں مزید کتنا وقت لگے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بظاہر یہ گھاؤ مندمل نظر آئے لیکن اندر سے آخری سانس تک ہرا رہے۔ تاہم ایک قیمتی ہیرے کے گم ہونے کا جو احساس مجھے بے کل کئے ہوئے ہے، میں نے مناسب سمجھا کہ اُسے آپ لوگوں سے شیئر کروں ۔ جو ان رشتوں کی قدر کرتے ہیں، ان سے اس لئے کہ شاید انھیں اس میں اپنی حسین رفاقت کا عکس نظر آئے اور جو انجانے میں اس رفاقت کی اہمیت اور قدر نہیں کر پائے وہ فوراً اس کا احساس کریں۔ خواہ شوہر ہو یا بیوی، عجلت یا جلد بازی میں کئے گئے فیصلے کے نتیجے میں ایک انسان سے قطع تعلق تو کیا جاسکتا ہے لیکن ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ جس دوسرے شخص کو زندگی میں لایا جاتا ہے نام اس کا بھی ''رفیق زندگی'' ہی

ہوتا ہے۔ چہرے بدلنے سے ہمسفر کی اہمیت ہرگز نہیں بدلتی۔۔۔ تو پھر کیوں نہ چہرے بدلنے کے بجائے اس خوبصورت رشتہ کی قدر کی جائے؟

آج رُخسانہ بظاہر میری زندگی میں چلتی پھرتی دکھائی نہیں دیتی لیکن میری زندگی کی ترتیب میں، معمولات میں، گھر کی روایات میں غرضیکہ میرے اس آشیانے کے کونے کونے میں رخسانہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کی دلآویز مسکراہٹ کو بات بات پر محسوس کرتا ہوں۔ کچھ عرصہ قبل، رُخسانہ کے بغیر میں پہلی مرتبہ لاہور گیا مگر ایک عجیب اور کربناک احساس ساتھ تھا۔ ہم جب بھی لاہور کے لئے روانہ ہوتے تو میں راستے میں اسکے من پسند جوس اور میٹھے پاپ کارن ضرور خریدتا۔ اب کی بار بھی میں اس روایت کو نہیں بھولا اور اس کی پسندیدہ چیزیں اس بار بھی خریدیں اور انہیں رخسانہ کی سیٹ پر رکھ لیا۔ تمام راستے میں اس سے ویسے ہی باتیں کرتا رہا جیسے ہم کیا کرتے تھے۔ اس سے پاپ کارن مانگ کر بھی کھاتا رہا اور یہ بھی نہیں بھولا کہ وہ زیادہ سفر سو کر گزارتی تھی سو اُس کے آرام میں ایک حد تک ہی مخل ہوا، ہاں البتہ لاہور پہنچ کر یاد آیا کہ میں تنہا تھا۔ ساتھ والی نشست پر خالی لفافے تو تھے مگر رخسانہ نہیں تھی جسے میں لاہور ٹال پلازہ پر پہنچ کر جگا دیا کرتا تھا۔

زندگی خوبصورت ہے۔ گو کہ اسے مزید حسین آپ کا ہم سفر بناتا ہے لیکن آپکے خلوص اور تعاون کے بغیر خوبصورت بنانا اس کیلئے ہرگز ممکن نہیں۔ وہ زندگی کے سفر میں مٹھاس ضرور گھولتا ہے لیکن شکر کی مقدار کا تعین آپ نے کرنا ہے۔ آپ کا فیصلہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ ہر جوڑے کو سدا سلامت اور ہنستا بستا رکھے۔ خوش رہیں آباد رہیں اور ایک دوسرے کی سانسوں میں بسیں۔ اور جو ایک نئے سفر کے آغاز کی تیاری کر رہے ہیں، ان کے لئے نیک خواہشات اور ایک نصیحت کہ

''جیون ساتھی کے دل میں بسیں اور اسے اپنے دل میں بسائیں، گھر سدا آباد رہے گا''۔

☆ ☆ ☆

میرا نائن الیون

آج موسم شدید گھٹن اور حبس والا ہے۔شاید کچھ اس وجہ سے کہ ستمبر کے ان دنوں میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے اور کچھ اس ہولناک سانحہ کے باعث جو گذشتہ رات میرے ساتھ پیش آیا! ایسا شدید بگولہ میں نے زندگی میں نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔ ہاں کتابوں، رسالوں اور ٹی وی سے ضرور پتہ چلتا رہتا تھا کہ یورپ امریکہ اور افریقہ میں نہایت مہیب ٹورنیڈو (بگولے) اور ریت کے طوفان آتے ہیں۔ اور وہ بھی ایسے کہ گھر کے گھر اُڑا کر میلوں پرے پھینک دیتے ہیں۔ایک ایسے ہی خوفناک ٹورنیڈو نے رات اچانک میرے آشیانے کو نشانہ بنایا اور آناً فاناً میرے ہنستے بستے گھر کو تہہ و بالا کر کے چلا گیا۔ ہوش آیا تو افراد خانہ کی گنتی کا خیال ذہن میں دوڑا۔خوفزدہ اور سہمے سہمے سب موجود تھے، اگر نہیں تھی تو میری عزیز از جاں رفیق زندگی رخسانہ نہیں تھی! جو شاید جانا نہ چاہتی ہو لیکن اجل کی دعوت کو بھلا کون ٹھکرا سکتا ہے؟ ناچار اُنتالیس سالہ رفاقت کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہونا پڑا۔

میں ایچ الیون اسلام آباد کے شہر خموشاں میں گم سم بیٹھا ہوں ۔عجیب اتفاق کہ آج تاریخ گیارہ ستمبر ہے جسے نائن الیون بھی کہتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ میرا نائن الیون تو آج ہوا ہے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں کہ کون مجھے دلاسہ دے رہا ہے اور کس کا ہاتھ میرے کاندھے پر ہے۔ اگر کچھ جانتا ہوں تو فقط اتنا کہ میرے دونوں بیٹے اپنی پیاری ماں کو اپنے ہاتھوں لحد میں

اُتار رہے ہیں۔ کبھی یہ ہاتھ ننھے منے ہوا کرتے تھے اور وہ انہیں وفورِ جذبات سے بیحد چوما کرتی تھی۔ شاید وہ انہیں اُجلا اور پاک کیا کرتی تھی؟ شاید اسے احساس تھا کہ انہی ہاتھوں نے اسے ایک روز اُسکی آخری آرام گاہ میں اُتارنا تھا؟

دونوں بیٹے اشکبار آنکھوں سے ماں کے جسدِ خاکی کی تدفین کر رہے ہیں اور میں نہایت بے بسی سے اپنے جیون ساتھی کو خاک نشین ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ شہر یار سہیل اور سرمد سہیل جانتے ہیں کہ انہیں بات بے بات پر سینے سے لگانے والا رشتہ انکے دکھوں اور پریشانیوں پر بے چین ہونے والا رشتہ آج منوں مٹی تلے دفن ہو رہا ہے۔ ماں زندہ رہے گی لیکن ممتا آج سپر خاک ہو رہی ہے۔ اپنی محبت کے ساتھ گزارے ماہ و سال، اس وقت میرے ذہن میں ایک فلم کی مانند چل رہے ہیں۔ اپنے ان بیٹوں کو جنم دیتے وقت کیا میری رخسانہ نے سوچا ہوگا کہ اس کی گود میں جو دو ننھے منے پل رہے ہیں وہ کسی دن یہ قرض، اپنی ماں کو اپنی آغوش میں اُٹھا کر آہوں اور سسکیوں کے درمیان، اسے دھرتی کی گود میں اُتار کر، چکانے کی کوشش کرینگے؟

کل دس ستمبر تھی چھوٹے بیٹے سرمد سہیل کا جنم دن اور آج گیارہ ستمبر ہے، بڑے فرزند شہر یار سہیل کا یوم پیدائش۔ ماں کو جانے کی جلدی تھی شاید اسی لئے اس نے دونوں کو ایک عجیب سا انجھا تحفہ دے ڈالا! دس تاریخ کو سانس کا رشتہ توڑا اور گیارہ تاریخ کو دنیا سے منہ موڑا۔ میری زبان پر آنے والا شکوہ، لبوں تک آتے آتے ذاتِ باری تعالیٰ کے شکر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ رب کائنات کی اپنی مصلحتیں ہیں اور یقیناً اس کے فیصلے بہترین ہوتے ہیں صرف ہم کم علم، جاہل اور غافل انسان انہیں سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ اور میں نے اپنے آنسوؤں کے سامنے ضبط کے بند باندھنے کی ناکام سعی کی ہوئی ہے۔ گال آنکھوں سے بہتے پانی سے تر ہیں اور میں بھنچے ہونٹوں سے مسلسل بڑبڑا رہا ہوں، ''یا حیُّ قبل کُلِ شئیً، یا حیُّ بعد کُلِ شئی ''، مجھ پر غنودگی سی طاری ہے۔ لحد میں اترتی رخسانہ

تو میری نظروں سے اوجھل ہو رہی ہے۔ لیکن جس الھڑ اور معصوم رخسانہ کے لئے میں پینتالیس برس قبل دل ہار بیٹھا تھا وہ یکا یک مسکراتی ہوئی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے۔ اور یادوں کا پنچھی ماضی کی جانب مائل بہ پرواز ہے۔

☆

ہماری بیحد پیاری نانی اماں، کنیز فاطمہ مرحومہ ۱۹۶۸ء میں ہمارے پاس قیام کے لئے آئیں۔ ان کے آنے سے ہمارے گھر کی روایتی رونقیں جاگ اُٹھیں اور ہماری خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ نانا ابا کی وفات کے بعد سے نانی اماں اپنی چاروں بیٹیوں نسیم اختر (ہماری امی)، انور سلطانہ، قمر سلطانہ اور شہزادی بلقیس کے ہاں باری باری قیام کیا کرتیں۔ کسی کے ہاں کم تو کسی کے ہاں زیادہ، البتہ شہزادی خالہ جو سب سے چھوٹی تھیں اور جنھیں میں باجی کہا کرتا تھا ان کے ہاں نانی اماں کا قیام غیر معمولی طور پر طویل ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس بار کچھ مختلف بات ہوئی۔ نانی اماں نے اپنے بھائی اور بھاوج کی درخواست کو پذیرائی بخشی اور کچھ عرصہ ان کے ہاں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے بھائی پروفیسر ملک بشیر الرحمٰن گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اُردو کے ناظم اعلیٰ اور ایک معروف ادبی و تعلیمی شخصیت تھے۔ نانی اماں کا وہاں قیام تھا کہ ایک روز ان کی چھوٹی ہمشیرہ اور سیالکوٹ کی معروف تعلیمی شخصیت اُمۃ المجید کے بیٹے اور ان کے بھانجے احمد ریاض ملک کا اپنے ماموں کے گھر آنا ہوا جہاں ایک مدت بعد ان کی اپنی خالہ کنیز فاطمہ سے ملاقات ہوئی۔ ماسی، شاید ''ماں سی'' ہوتی ہے۔ اس لئے بچے خالاؤں سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ ملک ریاض اصرار اور محبت سے اپنی خالہ کو اپنے ہاں لے گئے۔ ملک ریاض کی رہائش اسلامیہ پارک چوبرجی میں تھی۔ وہاں پہنچ کر نانی اماں کی ملاقات بہت سے ہم عمر قرابت داروں سے ہوگئی۔ ملک ریاض کو اللہ نے بہت بڑا دل دیا تھا۔ ان کا گھر، گھر کم اور ''اولڈ ایج ہوم'' زیادہ لگتا تھا۔ مکینوں میں ان کی ساس، سسر، بیوہ چچی، کبھی کبھار اپنے والد کا قیام اور اب خالہ، لیکن مجال ہے جو اہل خانہ کے ماتھوں پر کوئی شکن بھی اُبھری ہو۔ گھر کے بچے

بھی بزرگوں کی صدق دل سے عزت اور خدمت کرتے تھے۔ ملک ریاض اور ان کی اہلیہ کچھ ہی عرصہ قبل ایک جانکاہ صدمے سے دوچار ہوئے تھے۔ جب ان کا جواں سال بیٹا نعیم ریاض گردوں کی سوزش میں مبتلا ہو کر کم عمری میں ہی خالق حقیقی سے جا ملا تھا۔ ان دونوں اور دیگر اہل خانہ کے لئے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ جس وقت نعیم کا جنازہ اُٹھایا جا رہا تھا، ڈاکیہ اس کے میٹرک کے امتحان کا رزلٹ لے کر ملک ریاض کے دروازے پر کھڑا تھا، جس میں مرحوم نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔ بہر حال زندگی کی گاڑی چلتی رہی۔ نانی اماں کے لئے محال تھا کہ وہ کسی بھی جگہ دو تین ماہ سے زیادہ وقت گذار سکتیں، سو حسب عادت کچھ ہی عرصہ بعد اپنے بھانجے ریاض سے راولپنڈی اپنی بڑی بیٹی نسیم الطاف (میری والدہ) کے پاس جانے کے لئے اصرار کیا۔ ان کے بچوں نے بہت روکا مگر نانی اماں جب آئی پر آتیں تو کبھی نہ ٹلتی تھیں؟ بالآخر بچوں نے ان سے واپسی کا وعدہ لے کر مشروط اجازت دے دی اور یوں نانی اماں ۱۹۶۸ء کی غالباً تیسری سہ ماہی میں کسی وقت ہماری مہمان ہوئیں۔ اس زمانے میں والد مرحوم الطاف پرواز کی رہائش سٹلائیٹ ٹاؤن کے ایک کرائے کے مکان میں ہوا کرتی تھی۔ مکان کیا تھا بس دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا لیکن مکینوں کے دل بہت وسیع تھے۔ والد صاحب اپنی خوشدامن کی بے حد عزت کیا کرتے تھے سو وہ جب بھی آتیں سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ ہم بچے نانی اماں کے قصے کہانیوں کے ویسے ہی بیحد شوقین تھے اور مجھے تو جیسے بزرگوں کے کارنامے سننے کا خبط اور چسکا تھا، سو یوں سمجھئے کہ ہماری عید ہو گئی تھی

وہ قصے، قصیدے، وہ باتیں پُرانی
چلو پھر سُنا دو، ہمیں پیاری نانی

سہیل پرواز

میں اس وقت میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو چکا تھا۔ جوں ہی شام کے سائے گہرے ہوتے ہم سب بہن بھائی نانی اماں کو گھیر کر بیٹھ جاتے اور وہ بھی مجال ہے جو ہمیں بور

ہونے دیتیں۔لیکن اس دفعہ ہم نے ایک بتدیلی محسوس کی۔نانی کی باتوں میں جنوں اور پریوں کا ذکر کم جبکہ ملک ریاض اورانکے بچوں کا تذکرہ زیادہ تھا۔حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم بھی اپنے ان نادیدہ رشتہ داروں کا ذکر نہایت ذوق وشوق سے سُنتے اور ذرہ بھر بھی نہ اکتاتے۔ایک روز باتوں باتوں میں چھوٹے بھائی طاہر پرواز نے نانی اماں سے استفسار کیا کہ ماموں ریاض کے کتنے بچے ہیں۔نانی جی نے سب سے پہلے توان کے بیٹے نعیم کی ناگہانی موت کی خبر دی اس کے بعد باقی بچوں کے بارے میں بتانے لگیں کہ فاروق سب سے بڑا ہے جو بلّے کا ہم عمر ہے۔(میرا بچپن کا پیار کا نام بِلا تھا اور نانی اماں مجھے ہمیشہ اسی نام سے بُلایا کرتی تھیں)۔اس سے چھوٹی رخسانہ ہے اور پھر فرزانہ اور راحیلہ ہیں۔نانی اماں نے تمام بچوں کے نام لئے لیکن میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر رہا ہوں کہ میری تو کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی پھر ایسی کیا بات تھی کہ جب نانی اماں نے رخسانہ کا نام لیا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔تب مجھ پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ برخوردار تمہیں اب کہانیوں کے حوالے سے اپنا ذائقہ بدلنا ہوگا۔اس وقت بات آئی گئی ہوگئی۔لیکن سوئی ایک نام پر اٹک چکی تھی۔ مجھے نانی اماں کو مزید کریدنا تھا۔رخسانہ کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا تھی،سو میں اس موقع کی تلاش میں تھا جب نانی جی اکیلی ہوں کیونکہ امی کے یکلخت بدلتے تیوروں سے مجھے بیحد خوف آتا تھا۔ بالآخر ایک دن مجھے وہ موقع مل گیا۔ مجھے بات گھما پھرا کر معلومات اکٹھی کرنا تھیں۔بجا ہے کہ اگلے وقتوں بزرگ نہایت سادہ لوح ہوتے تھے لیکن ان کے جہاندیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔میں نے رنگ و روپ،نین نقش کے بارے میں درجنوں بالواسطہ سوالات کئے جن کا جواب مجھے یوں ملا کہ سانولی سلونی،بلی آنکھوں والی ہے،لمبی چُٹیا ہے اور اندرا گاندھی کی طرح سوہنی ہے۔یہ ٹین ایج ہوتی ہی ایسی ہے کہ خواہ مخواہ دل میں ٹین کھڑکتے رہتے ہیں۔اُس عمر میں بھی اندرا گاندھی نسوانی حُسن کیلئے میرا معیار تھی۔ابھی میں اس تصوراتی پیکر کو ذہن میں سجا ہی رہا تھا کہ نانی اماں نے باؤنسر دے مارا،''بلے!میں تیرا ویاہ اوہدے نال نہ کرادیواں؟''(بلے!میں تمہاری شادی

اس سے نہ کرادوں؟) میں گھبرا کر بدکا گویا چوری پکڑی گئی ہو۔ میری ابھی مسیں بھی پوری طرح نہ بھیگی تھی لیکن اس زمانے کے بزرگوں کے لاڈ کا اپنا ہی انداز ہوتا تھا۔ نادان عمر تھی سو، من میں جیسے لڈو پھوٹ پڑے ہوں۔ لگا جیسے کل ہی رشتے کی بات چلا دی جائیگی۔

خط و کتابت کا زمانہ تھا۔ ٹیلیفون بھی پچاس میں سے کسی ایک گھر میں ہوتا تھا اور ہنگامی خبر بھی تار یعنی ٹیلیگرام کے ذریعے دی جاتی تھی۔ ڈیڑھ دو ماہ بعد اچانک ایک روز ماموں ریاض کا خط ملا جو نانی اماں کے نام تھا اور جس میں ان سے التماس کی گئی تھی کہ سب اُداس ہیں اور یہ کہ وہ جلد واپس لوٹیں۔ امی نے ناراضگی کا اظہار بھی کیا کہ سگی بیٹی پر بھانجے کو فوقیت دی جا رہی ہے لیکن نانی اماں نے فیصلہ کر لیا تھا سو ایک روز بذریعہ ٹرین لاہور کے لئے روانہ ہو گئیں۔ سب بہت اُداس تھے لیکن میں گھر کا وہ واحد فرد تھا جو دل ہی دل میں خوش تھا۔ عام حالات میں شاید میں بھی اُداس ہوتا لیکن مجھے اس بات میں رتی بھر شک نہ تھا کہ نانی اماں لاہور پہنچتے ہی سب سے پہلے رُخسانہ سے میرا غائبانہ تعارف کرائیں گی۔ ادھر نانی اماں لاہور کے لئے روانہ ہوئیں اور ادھر میں نے تصورات کے شہر کا رُخ کیا۔ گھر پھر پرانی ڈگر پر چل پڑا تھا۔ سب کی اپنی اپنی مصروفیات اور اپنے اپنے کام۔

وہ ایک لفظ، محبت!

کالج کی زندگی شروع ہو چکی تھی۔ طریقہ تعلیم سکول سے علیحدہ اور غیر نصابی سرگرمیاں بھی سکول کی زندگی سے یکسر مختلف تھیں۔ تقریری مقابلوں کے لئے دوسرے شہروں میں جانا ہوتا تھا۔ بچگانہ عادات (اور حرکات) رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ منہ پھٹ انداز میں بات کی جائے تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم جوان ہو رہے تھے۔ کالج الیکشن کا زمانہ آیا تو ہم پر بھی جائنٹ سیکریٹری کی نشست کے لئے مقابلے کا خبط سوار ہوا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں قطعاً کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی کہ ابتدائی زندگی کے بیشتر فیصلے نہایت غیر سنجیدگی یا لااُبالی پن سے کئے۔ کامیابی مقدر بنی تو بہت خوب اور اگر کبھی قسمت نے ساتھ نہ دیا تو دل کو نہیں لگایا۔ کالج یونین کا الیکشن لڑنا بھی کسی مقصد سے زیادہ تفریح اور اپنی محسوس ہونے والی مقبولیت کی تصدیق تھی۔ نام بطور اُمیدوار داخل کرایا تو پبلسٹی کا بھی خیال آیا۔ اللہ نے خوشخطی اور مصّوری کی خداداد صلاحیتوں سے نوازا تھا سو اپنے پوسٹر اور بینر خود ڈیزائن کئے اور لکھے۔ ہاں البتہ انہیں آویزاں کرنے میں یار دوستوں نے دل و جان سے مدد کی۔ ایک روز بعد دوپہر پوسٹر لگانے کے لئے نکلا تو سوچا کہ اپنے ہم جماعت مسعود مفتی کو بھی ساتھ لے لوں جس کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔ اس کے ہاں پہنچا تو مسعود کے والد اپنے ایک دوست کے ساتھ برآمدے میں بیٹھے ملے۔ میں نے سلام کیا اور مسعود کو لیکر کالج کی جانب چل پڑا۔ راستے میں اس سے پوچھا

کہ یہ مسحور کن شخصیت کے مالک اسکے والد کے دوست کون تھے؟ مسعود تعارف کراتے ہوئے بولا، ''ابو کے بنک کے دوست ہیں آجکل کیمبلپور (اٹک) میں تعیناتی ہے''۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ نام احمد ریاض ملک ہے۔ میں وہیں راستے میں چونک کر کھڑا ہوگیا۔ مسعود نے وجہ پوچھی تو میں نے اسے بتایا کہ یار وہ تو میرے ماموں ہیں۔ مسعود میری غیر سنجیدہ طبیعت سے بخوبی واقف تھا۔ بولا، ''اللہ کو مانو، کبھی تو سنجیدگی اختیار کرلیا کرو''۔ میں سُنی ان سُنی کرتے ہوئے بولا، ''مسعود یار! میں واپس جا رہا ہوں ان سے ملنے'' یہ کہہ کر میں واپس پلٹ کر دوڑ پڑا۔ مسعود بھی میرے پیچھے پیچھے دہائی دیتے ہوئے بھاگا، ''اوئے خدا کا واسطہ ہے ابو سے مار نہ پڑوا دینا''۔ ہم واپس مسعود کے بنگلے پر پہنچے تو ملک ریاض صاحب، مسعود کے والد سے رخصت طلب کر رہے تھے۔ جونہی ہم گیٹ سے داخل ہوئے وہ دونوں چونکے۔ میری بے وقوفی کا اندازہ کیجئے کہ جس شخص سے زندگی بھر ملاقات نہیں ہوئی ان سے سوال کیا کر ڈالا۔ میں نے والہانہ انداز میں ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، ''ماموں! آپ نے مجھے پہچانا''؟ ظاہر ہے انھوں نے انکار میں ہی سر ہلانا تھا۔ سو پہلے تو انھیں اپنا نام بتایا لیکن جب انھیں مسلسل کنفیوژ پایا تو مزید تعارف کرایا، ''ماموں! میں آپکی خالہ زاد بہن نسیم کا بیٹا ہوں''۔ اب ان کے چہرے پر پرتپاک مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ میں نے گھر چلنے کے لئے اصرار کیا تو معذرت کرتے ہوئے بولے کہ وہ ابھی تو لاہور کے لئے نکل رہے ہیں لیکن جب ایک ہفتے بعد واپسی ہوگی تو ضرور سب سے ملیں گے۔ میں بے حد خوش تھا اس لئے نہیں کہ ماموں سے ملاقات ہوئی بلکہ سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا، اس لئے کہ رُخسانہ کے والد سے ملا جنہوں نے شفقت کا اظہار کیا۔ جو یقیناً لاہور جا کر اس دلچسپ ملاقات کا تذکرہ کرینگے۔

کوئی ہفتہ بھر کے بعد ماموں ریاض کی راولپنڈی آمد ہوئی تو حسب وعدہ انھوں نے گھر کو رونق بخشی۔ سب سے ملاقات ہوئی دونوں طرف سے گرمجوشی کا مظاہرہ ہوا۔ ملنے ملانے کے وعدے ہوئے امی نے بچوں کو گرمیوں کی چھٹیوں میں پنڈی بھیجنے کو کہا جس کے لئے انھوں

نے فوراً خوش دلی سے ہامی بھرلی اور میرا دل مارے خوشی کے یوں بلیوں اچھلنے لگا جیسے وہ لوگ کل ہی پہنچ رہے ہوں۔ میرے خیال میں اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ اب اس عمر میں آ کر اس عمر کے نوجوانوں کو دیکھتا ہوں تو پچاس، ساٹھ اور کسی حد تک ستر کی دہائی کے نوجوان نہایت سادہ لوح نظر آتے ہیں۔ محبتیں زیادہ تر خاموش ہوا کرتی تھیں۔ بقول شاعر ؎

تم میں ہمت ہے تو دُنیا سے بغاوت کر لو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

رابطوں کے ذرائع بھی محدود ہوا کرتے تھے۔ لے دے کر کاغذ قلم کا ہی سہارا ہوا کرتا تھا۔ اور اس کے لئے بھی ہزار ہا جتن کر کے موزوں نامہ بر ڈھونڈنا پڑتے تھے۔ محبت کرنے والے محتاط بلکہ اپنی دانست میں بیحد محتاط ہوتے تھے۔ زمانہ محبت کا دشمن اور گھر کے بزرگ نوالہ سونے کا کھلا کر آنکھ شیر کی رکھا کرتے تھے۔ ان سب رُکاوٹوں کے باوجود جو محبت پروان چڑھ جاتی وہ لازوال ہوتی۔

بات میرے خوش ہونے کی ہو رہی تھی۔ کچھ ہی عرصہ بعد امی جی کا کسی کام سے لاہور جانے کا پروگرام بنا۔ چونکہ بڑا ہونے کے ناطے امی اور ابا جی اکثر مجھے ہی ہر جگہ ساتھ رکھا کرتے تھے سو میں نے فرض کر لیا کہ اس بار بھی امی مجھے ہی لاہور ساتھ لے جائیں گی لیکن میرے ارمانوں پر اس وقت اوس پڑ گئی جب عین آخری لمحات میں انہوں نے چھوٹے بھائی طاہر کو ساتھ لے جانے کا عندیہ ظاہر کیا۔ تمام حالات میں شاید مجھے اس بات کا قلق نہ ہوتا لیکن مصیبت یہ تھی کہ میں بزرگوں کی وہ گفتگو سُن چکا تھا جس میں میری ماں نے ماموں ریاض کی طرف بھی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ مجھے اپنا خود ساختہ استحقاق مجروح ہوتا نظر آیا لیکن بے بس تھا کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ طاہر نے بھی میرے حق میں دستبرداری سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ظاہر ہے میں اس کی جگہ ہوتا تو اسی عمومی رویئے کا مظاہرہ کرتا کہ اس عمر میں بہن بھائیوں میں یہ خوبصورت اختلافات تو ہوا ہی کرتے ہیں۔ خیر امی لاہور گئیں بھی اور ہفتہ بھر بعد

واپس بھی آ گئیں۔انہوں نے سب کی بیحد تعریف کی لیکن جو تفصیلات مجھے درکار تھیں وہ صرف طاہر سے مل سکتی تھیں۔ذرا فرصت ہوئی تو میں طاہر کو لیکر بیٹھ گیا۔اپنی دانست میں ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بات فاروق اور دیگر بچوں سے شروع کی اور رُخسانہ پر لاکر ختم کی۔اس نے جو تفصیلات بیان کیں۔وہ نانی اماں کی بیان کردہ تشریح سے کسی طور بھی مختلف نہ تھیں۔طاہر سے جب سب کچھ سُنا تو بے کلی تو بڑھی ہی لیکن تشنگی بھی دو چند ہو گئی۔

جلد ہی اللہ نے میری سُن لی۔گرمیوں کی تعطیلات ہوئیں تو یہ خوشخبری سُننے کو ملی کہ ممانی حفیظ بچوں کے ہمراہ راولپنڈی آ رہی ہیں۔جنھیں انتظار کی بے چینی اور لذت کا اندزاہ ہو وہی میری خوشی کو محسوس کر سکتے ہیں۔جس روز اور جس وقت انہوں نے آنا تھا وہ میرے کالج کا وقت تھا۔ہم دونوں بھائی، طاہر اور میں گورنمنٹ کالج اصغر مال راولپنڈی میں زیرِ تعلیم تھے۔ یہ غالباً جولائی ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ہمیں ابھی چھٹیاں نہیں ہوئی تھیں تاہم اسکولوں میں گرمیوں کی تعطیلات ہو چکی تھیں۔مہمان اپنی کار پر کسی بھی وقت پہنچ رہے تھے اور ادھر میں شدید خواہش کے باوجود کالج سے غیر حاضری کی جرأت نہیں کر پا رہا تھا۔نہایت بے دلی سے کالج چلا تو گیا لیکن دھیان جی ٹی روڈ پر تھا؛ اب وہ لوگ یہاں پہنچے ہونگے، اب یہ پل پار کیا ہوگا، اب روات کے نزدیک ہونگے، وغیرہ وغیرہ۔ میں خود بھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ جس شخص سے آج تک ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی اس کے لئے اتنی بے چینی ، بے تابی اور اتنا انتظار کیوں؟ خدا خدا کر کے کالج سے فراغت ہوئی تو میں گھر کی طرف لپکا۔ جونہی گلی کا موڑ مڑا تو گھر کے سامنے سفید رنگ کی واکسہال کار کھڑی نظر آئی۔''اوہ! تو یہ لوگ پہنچ چکے ہیں'' میں نے خود کلامی کی۔ سب سے پہلے کون ملے گا؟ رُخسانہ کا سامنا کیسے کروں گا؟ یوں، جیسے میں نے رُخسانہ سے ادھار لیا ہوا تھا اور چھوٹتے ہی وہ اپنی رقم کی واپسی کا نہایت درشتی سے تقاضا کریگی۔اپنے ہی گھر میں جھجکتے جھجکتے داخل ہوا۔جیسا پہلے کہیں ذکر کر چکا ہوں کہ دو کمروں کا فلیٹ تھا۔مہمان ماشاءاللہ خاصے تھے۔سو گھر پر عملاً مہمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔پرانے رہن سہن کے عادی بخوبی

جانتے ہیں کہ دو کمروں کے گھر میں ساٹھ کی دہائی میں ڈرائنگ ، ڈائینگ اور بیڈ رومز کا کوئی تصور نہ تھا۔ ایک کمرے کو بیٹھک کا درجہ ملتا تھا جہاں مہمانوں کی آؤ بھگت ہوتی تھی اور ہماری بیٹھک میں نقش کاری والا پرانا پلنگ پڑا تھا جس کے سامنے ایک واجبی سا صوفہ اور دوسرے کمرے میں دو چار پائیاں ہمہ وقت بچھی رہتی تھیں۔ رات سونے سے پہلے دونوں کمروں میں ایک ایک چھوٹی چار پائی اور بچھائی جاتی جسے الصبح استعمال کرنے والے کو اُٹھانا ہوتا تھا۔ مہمانوں کی صورت میں صحن کی جانب ایک برآمدہ تھا جہاں اضافی چار پائیاں بچھا کر گھر والے باہر منتقل ہو جاتے تھے۔ یہ ایک نامور شاعر ادیب اور صحافی الطاف پرواز کا گھر تھا جہاں وہ بطور کرایہ دار مقیم تھے اور حلال کی تنخواہ کے کل ماہانہ چار سو روپوں میں دیگر گھریلو اخراجات اور ہماری فیسوں کے علاوہ ایسا ہی گھر کرائے پر لیا جا سکتا تھا۔ افراد خانہ میں اباجی اور امی کے علاوہ میں، مجھ سے چھوٹا بھائی طاہر پرواز ،ہمشیرہ حمیرا، زبیر، اور سب سے چھوٹا عامر الطاف تھا۔ ہمارے گھر کا ایک اہم فرد والد صاحب کے منہ بولے بھائی شیخ محمد عبداللہ، جو ہمیشہ سے ہمارے ساتھ رہے تھے، اسی گھر میں ہمیں ۱۵ جولائی ۱۹۶۵ء کو داغ مفارقت دے کر جا چکے تھے۔

بات ان مہانوں کی ہو رہی تھی جن کا مجھے شدت سے انتظار تھا اور چند ہی لمحوں بعد جن سے میری ملاقات ہونے جا رہی تھی ۔ جونہی بیٹھک کے کواڑ کھول کر میں اندر داخل ہوا سامنے کوئی نصف درجن بیگ اور اٹیچی بکھرے نظر آئے۔ سات اور پانچ سال کی دو ننھی منی بچیاں میرے چھوٹے بھائی عامر کے ساتھ کھیل کود میں مصروف نظر آئیں۔ ایک دوشیزہ دروازے کی جانب پشت کئے بیگ میں سے کچھ نکالنے میں مصروف تھی ۔ دل نے کہا یہی رخسانہ ہے ابھی دل کی دھک دھک کو سنبھالنے میں مصروف تھا کہ وہ کھڑی ہوئی اور دروازے کی آہٹ پا کر میری جانب مڑی۔ سر کے اشارے سے حیا دارانہ انداز میں سلام کیا، جیسا کہ اس زمانے میں اجنبی نوجوان لڑکے لڑکیوں کا وطیرہ ہوا کرتا تھا لیکن مجھ پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ کاٹو تو جیسے بدن میں لہو ہی نہیں۔ یا اللہ! نانی اماں اور طاہر نے تو کوئی اور ناک نقشہ بیان

کیا تھا۔ لڑکی خوش شکل تو تھی لیکن نہ وہ لمبے سُنہری بال بقول نانی اماں کے 'لمبی گُت' (لمبی چٹیا) اور نہ ہی وہ بادامی ہرنی جیسی آنکھیں جنھیں میں تصور میں سجائے بیٹھا تھا۔ گھر کے سب افراد سے غائبانہ تعارف تھا سو، سامنے کھیلنے والی ننھی بچیوں کے بارے میں بھی علم تھا کہ یقیناً ان میں سے ایک فرزانہ ریاض اور دوسری راحیلہ ریاض تھی۔ مجھے فاروق ریاض بھی تو کہیں نظر نہیں آرہا تھا کہ اسی سے علیک سلیک کر کے خود اعتمادی ہی بحال کر لیتا۔ اب اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ اُسی دوشیزہ سے ہی پوچھ لیتا کہ آپ رُخسانہ ہیں؟ بالآخر اپنے تصورات کے کرچی کرچی ہوتے محل کو سنبھالا دیتے ہوئے میں نے اسی سے رسمی سوال کر ڈالا ''ممانی جان اندر ہیں کیا''؟

وہ شاید مجھے پہچان چکی تھی، مسکراتے ہوئے بولی، ''جی ممانی جان، فاروق اور رُخسانہ ادھر دوسرے کمرے میں بیٹھے ہیں''۔

میرے چکنا چور ہوتے محل کو جیسے سہارا مل گیا ہو اور ذہن سے یکدم بہت بڑا بوجھ اُتر گیا۔ ایک لمبی سانس لی اور دوسرے کمرے کی جانب بڑھا ہی تھا کہ مشترکہ دروازے کا پردہ ہٹا اور ایک معصوم اور خوبصورت چہرہ پردے کی اوٹ سے برآمد ہوا۔ شرارت کرتی ہوئی جھیل سی آنکھیں، مُسکراتا ہوا دہانہ۔ بیشک نانی اماں نے نین نقش بیان کرتے وقت کوئی غفلت نہیں برتی تھی۔ مجھے رُخسانہ کو پہچاننے میں بالکل کوئی وقت نہ لگا۔ شرماتا ہوا سلام اور میرا بوکھلاہٹ زدہ وعلیکم السلام، دونوں میرے ذہن پر نقش ہو گئے اور آج بھی روز اول کی طرح مجھے اس طرح یاد ہیں جیسے کل کی بات ہو۔ وہیں ساکت و جامد میں سوچنے لگا کہ میں نے تو رخسانہ کو ذہن میں بٹھایا ہی تھا لیکن شرم و حیا میں لپٹا رخسانہ کا پر اشتیاق سلام؟ کیا اُسے بھی مجھ سے ملنے کا اتنی ہی شدت سے انتظار تھا؟ یہ سُہیل کی، اپنی غیر اعلانیہ، ان دیکھی اور یکطرفہ محبت سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ سفر جو نانی اماں کے تعارف سے شروع ہوا تھا اس نے آج ابتدائی منزل طے کر لی تھی۔ رُخسانہ اپنی اس عزیزہ سے مخاطب ہوئی تو دونوں میں شوخ مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور میں موقع پا کر دوسرے کمرے کو ہو لیا جہاں ممانی جان اور فاروق سے علیک سلیک کے بعد نانی اماں کی

بڑی ہمشیرہ نھو بیگم جو اماں نھو کے نام سے مشہور تھیں، سے سامنا ہوا۔ سلام کیا دُعا لی اور امی سے نانی اماں بارے پوچھا کہ وہ نہیں آئیں؟

امی سے پہلے اماں نھو دبنگ آواز میں بولیں "بہن کنیز، شہزادی کے پاس رہنے گئی ہے"۔

شام تک میں سب سے خاصا گھل مل چکا تھا اور فاروق سے تو گاڑھی چھننے لگی تھی۔ فاروق خاصا ملنسار اور رونقی تھا اس نے شرارتی انداز میں بتایا کہ خاندان کے بچے اماں نھو سے بہت ڈرتے ہیں اور ابا جی نے انھیں ہم پر نظر رکھنے کے لئے ساتھ بھیجا ہے۔ اگلے تین روز نہ جانے کیسے گزر گئے۔ گھر کی رونق اور گہما گہمی میں گوناں گوں اضافہ ہوا تھا۔ اسی دوران ابا جی نے اپنے کسی عزیز سے کہہ کر ایبٹ آباد میں دو کمروں کا انتظام کر دیا تھا۔ جہاں مجھے ان لوگوں کے ایبٹ آباد جانے کا افسوس تھا وہاں پر ایک بار پھر یہ خوش فہمی بھی تھی کہ انھیں وہاں چھوڑنے کے لئے امی کے ساتھ میں ہی جاؤں گا اور اسی بہانے مزید تین روز اپنے عزیزوں اور خاص طور پر رخسانہ کی نظروں کے سامنے گزار سکوں گا۔ محبت تو آگ میں بے دھڑک کودنے کو تیار تھی لیکن عقل، دل کو مستقل خوفزدہ کیئے ہوئے تھی۔ ذہن میں خیالات کی جنگ جاری تھی دل میں خیال آتا کہ رخسانہ کو کہہ ڈالوں مجھے اس سے دیکھے بنا ہی انس ہو گیا تھا، جواب محبت میں تبدیل ہو رہا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے دماغ ڈرا دیتا "پاگل ہوئے ہو؟ ابھی اچھی طرح اسے جان نہیں پائے اور چلے ہو اظہار محبت کرنے؟"

واہ میاں مجنوں! کیا خبر اس نے غصیلی طبیعت پائی ہو؟ چلو غصیلی نہ سہی لیکن کم از کم تمھاری اس بچگانہ حرکت پر وہ تمھیں جھاڑ تو پلا ہی سکتی ہے۔ اور اگر کہیں اس نے اپنی یا تمہاری امی کو شکایت کر دی تو جناب ہرن ہو جائیگا یہ محبت کا نشہ آپکا۔ پھر منہ چھپاتے پھرنا تم سب سے اپنا۔ اس کشمکش میں ہم ایبٹ آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ اگلے دو دنوں میں مجھے دو دفعہ موقع ملا۔ پہلی دفعہ جب فلم "سالگرہ" دیکھنے گئے اور جسے میں نے محض اپنی شرافت (یا بزدلی) کی بنا پر ضائع کر دیا۔ گو کہ بعد میں کف افسوس ملتا رہا کہ میں پیشگی معذرت کر کے سلیقے سے بھی اظہار کر

سکتا تھا جو اسے بُرا بھی نہ لگتا اور زیادہ سے زیادہ وہ انکار ہی کرتی۔ دوسرا موقع اگلے ہی روز اس وقت ملا جب ہم الیاسی مسجد کی سیر کو گئے۔ سب لوگ ٹکڑیوں میں چل رہے تھے مجھ سے آگے رخسانہ اپنی عزیزہ شاہین کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول چل رہی تھی۔ دل میں آیا کہ اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔ میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ان دونوں کے درمیان جا پہنچا۔ گذشتہ ایک ہفتے کی شناسائی نے ہمیں ایک دوسرے سے قدرے بے تکلف کر دیا تھا۔ پاس جاتے ہی میں نے شاہین کی موجودگی کی پروا کئے بغیر کہا، ''رُخسانہ مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے''۔

رخسانہ نے معصومیت سے مسکراتے ہوئے کہا، ''جی! کیا کہنا ہے آپ نے''؟

دل میں سوچا کہ اتنی بھی کیا معصومیت؟ میرا اتنا کہنے سے ہی اُسے پتہ چل جانا چاہیے تھا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ چونکہ گھبراہٹ میں موزوں الفاظ فی الفور دستیاب نہیں تھے سو تھوڑا مزید وقت حاصل کرنے کی خاطر ایک ہلکا سا جملہ داغا۔ ''رُخسانہ میں تم سے صرف تین لفظ کہنا چاہتا ہوں۔''

فی زمانہ تو آپ ماشاء اللہ پرائمری کے نونہال سے بھی پوچھیں کہ کوئی اچھا لگے تو کونسے تین لفظ کہے جاتے ہیں تو تعلیمی نصاب کا بھلے علم ہو یا نہ ہو لیکن وہ تین لفظ جھٹ سے بتا دے گا۔ اس بات پر مجھے وہ بچہ یاد آ گیا ہے جسے ماں پوچھتی ہے کہ بیٹا ٹیپو سلطان کون تھا تو وہ نفی میں سر ہلاتا ہے کہ معلوم نہیں۔ ماں غصے سے سرزنش کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ پڑھائی پر دھیان دیا کرے۔ بچہ بھی آج کے زمانے کا تھا وہ بھلا کہاں چوکتا تھا۔ جواباً ماں سے پوچھا کہ وہ بتائیں کہ نوشین آنٹی کون ہیں۔ اب ماں کی باری تھی کہ انکار میں سر ہلائے اور کہے کہ اُسے علم نہیں۔ بچہ ماں کی نقل اُتارتے ہوئے بولا، ''ماما آپ بھی پاپا پر دھیان دیا کریں۔''

رخسانہ نے ایک مرتبہ پھر اُسی معصومیت سے پوچھا کہ کون سے تین لفظ اور عین اسی لمحے اللہ نے میری مدد کر دی ہمت کر کے بولا، ''تمہیں چاہتا ہوں''۔ رخسانہ چونکی اور شرم و حیاء سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ کوئی جواب دیے بغیر فوراً تیز تیز قدم بڑھاتی آگے نکل گئی۔

میں اپنی توقع سے کہیں پہلے منزل کے دوسرے پڑاؤ تک پہنچ گیا تھا۔شاید اپنی بے صبری طبیعت کے باعث؟ لیکن یہ اظہار فی الحال یکطرفہ تھا۔کان جس مژدۂ جانفزا کو سننا چاہتے تھے وہ ابھی ایک تشنہ خواب ہی تھا۔میں اگلے روز ادھورا خواب لئے واپس راولپنڈی آ گیا۔

ممانی جان اور بچے کوئی ایک ماہ کے لگ بھگ ایبٹ آباد میں رہے اور اس دوران امی کا تین دفعہ جانا ہوا مگر ہر بار طاہر یا پھر کوئی چھوٹا بھائی ان کے ہمراہ ہوتا۔ان لوگوں کی واپسی پر مجھے بیحد خوشی ہوئی لیکن رخسانہ میرے سامنے پہلے سے زیادہ محتاط اور خاموش رہتی البتہ باقی گھر والوں کے ساتھ گھل مل کر ہنسنا کھیلنا اسی طرح تھا۔ذہن عجیب الجھن کا شکار تھا کہ کیوں ؟ آخر میرے ساتھ ہی کیوں؟ بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب ان لوگوں کی واپسی تھی۔مجموعی طور پر ہم سب نے بہترین اور یادگار وقت گزارا تھا۔سب کو اداسی ہو رہی تھی اور مجھے اداسی کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی کہ رخسانہ میری خواہش بارے بنا کوئی وضاحت کئے واپس جا رہی تھی۔

مجھے سکول کے زمانے سے ہی ڈائری لکھنے کا بے حد شوق تھا جو ۱۹۸۰ء کے وسط تک باقاعدگی سے جاری رہا اور پھر رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔میری ڈائریوں میں پڑھنے والوں کو روزنامچے کے علاوہ گانے ،گیت ،اقوال زریں ،آٹوگراف اور راز دارانہ باتیں ،غرضیکہ سب کچھ مل سکتا تھا لیکن اپنی ڈائریاں میں نے تحریر بھی خود ہی کیں اور پڑھتا بھی خود ہی تھا۔اچانک ایک خیال سوجھا کہ کیوں نہ ان لوگوں سے آٹوگراف لئے جائیں۔

فاروق نے فیضؔ کا ایک شعر لکھا،شاہین نے بھی کوئی عام سا شعر لکھا۔لیکن مجھے تو یہ دیکھنا تھا کہ رخسانہ کیا لکھتی ہے۔ڈائری اس کے سامنے بڑھائی تو اس نے مسکراتے ہوئے ایک ادائے بے نیازی سے یہ شعر لکھا ؎

ترس رہی تھیں تری دید کو جو مدت سے
وہ بے قرار نگاہیں سلام کہتی ہیں

ہوسکتا ہے آج کے زمانے میں اسے ایک عام سطحی سا شعر سمجھا جائے لیکن اس زمانے کے ایک ایسے سوالی نوجوان کی نگاہ میں جسے اپنے سوال کا جواب درکار تھا یہ ایک بہت بڑا پیغام تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میری مہینہ بھر کی کلفتیں دور ہوگئیں ہوں۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ 'مہمان' تو چلی گئی مگر اپنی خوبصورت یادیں چھوڑ گئی۔ رخسانہ کی شرم وحیا میں ڈوبی خوبصورت 'رضامندی' میری ڈائری میں آج بھی موجود ہے۔

منزلِ مقصود کی جانب یہ میری ایک اور کامیابی تھی۔

چاہت مل گئی!

تجدیدِ تعلقات کے ساتھ ساتھ دونوں خاندانوں کے روابط بھی بڑھتے چلے گئے۔
لاہور میں خالاؤں اور دیگر عزیزوں کے علاوہ اب ایک گھر ماموں کا بھی تھا اور یہ وہ گھر تھا جو میرے نزدیک دیگر تمام گھروں سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اگر کبھی کالج کی طرف سے لاہور، مشاعروں یا تقریری مقابلوں میں جانا ہوتا یا پھر کوئی نجی دورہ ہوتا تو میرا پڑاؤ ماموں ریاض کے ہاں ہی ہوتا۔ ماموں، ممانی، نہایت خوش دلی سے آؤ بھگت کرتے، ہاں یہ ایک الگ بات ہے کہ ماموں آنکھ شیر کی رکھتے تھے اور ان کی یہ عادت صرف میرے حوالے سے ہی موقوف نہیں تھی بلکہ عام لوگوں کے معاملے میں بھی وہ بہت چوکنے اور محتاط، پرانی قدروں کے مالک انسان تھے۔ کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے، کتنا عرصہ رہے گا، ماموں ریاض حتیٰ الوسع ہر بات کی خبر رکھا کرتے تھے۔ میں جب بھی لاہور میں ہوتا تو دن میں تو ماموں زاد بچوں سے گھل مل جانے کا موقع مل جاتا لیکن ماموں کی بنک سے واپسی کے بعد ایک کمرے تک محدود ہونا پڑتا۔ لڈو، تاش یا صحن میں کرکٹ کھیلنا ایسے موقعے تھے جب رخسانہ سے بھی سرسری گپ شپ ہو جاتی جس میں زیادہ میں ہی بولتا تھا جبکہ وہ زیادہ سُنا اور مسکرایا کرتی تھی اور میرے لئے یہ بھی بہت تھا۔ نانی اماں جب بھی راولپنڈی آتیں میں ان کی پہلے سے زیادہ خدمت کرتا کیوں کہ وہ میری محسن تھیں۔ جہاندیدہ نانی اماں بھانپ لیں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ سو خوش ہو کر ایک فقرہ

داغ دیتیں، ''میں اپنے بلّے دا ویاہ رخسانہ نال ای کرنا اے''۔ (میں نے اپنے بلّے کی شادی رخسانہ سے ہی کرنی ہے)۔

اوران کا یہ ایک فقرہ جیسے مجھے سارے جہاں کی خوشیاں دے دیتا تھا۔ اگر کبھی امی سامنے ہوتیں تو وہ غصے سے بولتیں، ''اماں! مت اُلٹے اُلٹے لاڈ کیا کریں۔ اس کے پڑھنے لکھنے کے دن ہیں۔'' اکثر لاہور واپس جاتے ہوئے نانی سرگوشی میں رخسانہ کو کوئی پیغام دینے بارے پوچھتیں، اور میں جو پہلے سے ہی اس دعوت کا منتظر ہوتا تھا جھٹ سے جلدی میں لکھا تڑمڑ رقعہ نامہ بر نانی کے حوالے کر دیتا جسے وہ روائتی انداز میں پیسوں کے ساتھ پلّو میں باندھ لیتیں۔ گو کہ اب تک یہ خط و کتابت یکطرفہ ہی ثابت ہو رہی تھی۔

اسی دوران خاندان کے باخبر ذرائع اور خود نانی اماں سے مجھے معلوم ہوا کہ خاندان کے اندر اور باہر سے رخسانہ کے لئے پیغامات آنا شروع ہو گئے ہیں۔ میری راتوں کی نیندیں اُڑ چکی تھیں کہ اب کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ تمام رشتے برسرِ روزگار نوجوانوں کے ہی ہونگے؟ اور میں ٹھہرا ایک طالب علم جو ہنوز بی اے میں زیرِ تعلیم تھا۔ امی کی سخت طبیعت سے بخوبی واقف تھا اور ان سے اس معاملہ میں بات کرنے کی کم از کم مجھ میں ہرگز جرأت نہ تھی۔ یہ تقریباً ۱۹۷۰ء کے اواخر کی بات ہے کہ نانی اماں کا راولپنڈی کا چکر لگا تو میں نے کھل کر ان سے بات کی انھوں نے مجھے تسلی دی اور لگی لپٹی رکھے بغیر امی سے بات کر ڈالی جنھوں نے اس بات کا بیحد بُرا منایا اور اپنی ماں سے کہا کہ وہ سہیل کا دھیان پڑھائی سے ہٹا رہی ہیں۔ جب نانی نے کہا تم کونسا ابھی شادی کر رہی ہو بچے کا نام لے دو اور رخسانہ کا ہاتھ مانگ لو تو امی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ ساری عمر پڑی ہے کچھ بن جائے تو لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ پھر نام بھی لے دونگی۔ یہ وہ موقع تھا جب نانی اماں نے ترپ کا پتہ کھیلا اور کہا، ''ہاں لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہوگی مگر تمھیں شاید علم نہیں کہ سہیل رخسانہ کو پسند کرتا ہے''!!

امی تو جیسے سکتے میں آ گئیں کہ اتنی باخبر اور بچوں پر نظر رکھنے والی ماں اور ان کی ناک

کے عین نیچے یہ سب کچھ ہوا جس کا انھیں علم تک نہیں تھا! میں ساتھ والے کمرے میں بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ اس وقت تک ہم شبستان سینما کے عقب میں مکھا سنگھ اسٹیٹ کالونی میں اپنا گھر بنا چکے تھے جس کی تعمیر کے لئے ابا جی نے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے قرضہ لے رکھا تھا۔

مارے خوف کے میری ٹانگیں لرزنے لگیں کہ اب شامت آئی کہ آئی ۔ جب امی نے نانی اماں کو کورا جواب دے دیا تو نانی جی نے بھی اپنا آخری حربہ آزمایا جو عموماً وہ کسی سے بھی ناراضگی کے وقت استعمال کیا کرتی تھیں ۔ اگلے روز الصبح انہوں نے کوچ کا اعلان کر دیا اور مجھ سے اسٹیشن چھوڑ آنے کو کہا۔ امی ابا سب کی درخواستیں بے کار گئیں اور نانی ٹس سے مس نہ ہوئیں ۔ انھیں ریل کار سے لاہور کے لئے روانہ کر کے میں بوجھل قدموں سے گھر واپس آیا تو ماں کو اپنا منتظر پایا۔ وہ مجھے اپنے کمرے لے گئیں ۔ دروازہ بند اور میری شیرنی ماں کی دھاڑ شروع، ''تمھاری عمر ہے یہ حرکتیں کرنے کی؟ پہلے کچھ بن جاؤ لڑکیوں کی کمی نہیں ہے؟ میری تربیت کا یہ صلہ دیا ہے''؟ وغیرہ وغیرہ

لگ بھگ ایک گھنٹہ کی تقریر کے دوران میں مجرموں کی طرح سر نیچے پھینکے سب کچھ سنتا رہا اور آنکھوں میں آنسو لئے اس وقت باہر آیا جب مجھے عدالت چھوڑنے کی اجازت ملی ۔ گراؤنڈ فلور اور پہلی منزل کے درمیان سیڑھیوں پر بنی گیلری میرے زیر استعمال ہوتی تھی ۔ میں گیلری میں گیا، دروازہ بند کیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ شام تک کسی نے رابطہ نہ کیا اور نہ کوئی بلانے آیا۔ مغرب کے کچھ ہی دیر بعد ظفر خالد نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میں نے دروازہ کھولا ۔ ظفر میرا اسکول کا ساتھی، جگری دوست اور ہمراز تھا۔ اور وہ اس پورے معاملے سے آگاہ تھا۔ جب اُسے حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا تو اُسے بھی تشویش لاحق ہوئی ۔ ہم دونوں بقراط سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اب کیا کیا جائے ۔ اب اس عمر میں آ کر اگر اُن باتوں کو سوچا جائے تو بچگانہ لگتی ہیں لیکن اس زمانے میں یہ بات ثانوی حیثیت رکھتی تھی کہ آپ کماؤ ہیں یا ابھی درسگاہ کی گھنٹی بجا رہے

ہیں۔ایسی صورت حال میں بس اتنا معلوم تھا کہ آپ کسی کو دل و جان سے چاہتے ہیں اور جس کو دل دے بیٹھے ہیں وہ کسی اور کی ہونے جارہی ہے۔ایک ہی بات ذہن میں بار بار ہتھوڑے برسا تی تھی کہ برخودار! اگر لگن سچی ہے تو کچھ کر گزرو ورنہ بس چھوٹ گئی تو ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔

ظفر نے معزز بننے کی کوشش کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ کیوں نہ وہ خالہ جی سے بات کرے؟ بات میرے دل کو بھی لگی اور میں نے ہامی بھر لی۔وہ گیلری سے اُتر کر گھر میں گیا اور سیدھے سبھاؤ امی سے بات کر دی جنہوں نے ظفر کی تو موقع پر ہی معقول عزت افزائی فرمائی لیکن میری غائبانہ کلاس لینا بھی نہ بھولیں۔قابلِ سمع جھاڑ پلاتے ہوئے فیصلہ صادر کیا کہ ساری عمر پڑی ہے پہلے کچھ بن جائے تو پھر شادی کے چونچلے کا بھی سوچ لے۔میں گیلری میں ظفر کی واپسی کا منتظر تھا، گو کہ اُمید کچھ خاص نہ تھی لیکن یہ تجسس ضرور تھا کہ ظفر کیا خبر لاتا ہے۔اتنے میں گیلری کا دروازہ کھلا مگر وہ ظفر نہیں بلکہ چھوٹا بھائی زبیر تھا جو امی کا بلاوہ لایا تھا۔رہا سہا خون بھی خشک ہونے لگا لیکن ہمت مجتمع کی۔دل نے کہا کہ تھوڑی جرأت پیدا کرو اور اپنا نقطۂ نظر بیان کردو، آگے اللہ مالک ہے۔دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو امی سامنے پلنگ پر بیٹھی نظر آئیں جبکہ ظفر کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔میں بھی خاموشی سے جا کر ظفر کے ساتھ بیٹھ گیا۔

امی جان وقت ضائع کئے بغیر مجھ سے مخاطب ہوئیں، ''میرا خیال تھا کہ صبح کی نصیحت نے تم پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا ہوگا''؟

''جی''، میرے منہ سے بس اتنی بات نکل سکی۔

''یہ ظفر کیا کہہ رہا ہے؟ کیا تمہارے منہ میں زبان نہیں تھی جو تم نے اس کو وکیل بنا کر بھیجا ہے''؟ امی گرجیں۔

میں نے پہلی بار جرأت کر کے سر اُٹھایا اور حوصلہ سمیٹ کر جواب دیا، ''ظفر بھی میرا بھائی ہے۔آپ کو شاید میں اپنی بات سمجھا نہیں پایا تھا سو خیال کیا کہ اس کے ذریعے آپ تک اپنی بات پہنچاؤں''۔

امی کا اور میرا بہت خوبصورت رشتہ تھا عام زندگی میں ہم دوست تھے۔ اکثر فخر سے کہا کرتی تھیں کہ ہم دونوں عاشق معشوق ہیں۔ خوش گپیاں اور مذاق حد سے زیادہ ہوتا تھا لیکن سنجیدہ معاملات میں جب وہ جلال میں آتیں تو میرے لئے یہ سوچنا بھی محال ہو جاتا کہ ہم دوست ہیں۔ ابا جی سے البتہ میں ہمیشہ ڈرتا رہا حالانکہ وہ بچپن سے مجھے ہر جگہ ساتھ ساتھ رکھا کرتے تھے، خواہ وہ دفتر ہوتا، مشاعرے یا ادبی محفلیں۔ میں بچپن میں ہی بچوں کے جریدوں پندرہ روزہ ہدایت لاہور اور تعلیم و تربیت لاہور کے دفاتر کے علاوہ ریڈیو پاکستان لاہور کی سیر بھی کر چکا تھا اور حفیظ جالندھری، احسان دانش، ساغر صدیقی، ایوب رومانی، قتیل شفائی، میرزا ادیب، حسن بخت، شہزاد احمد شہزاد، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، زیڈ اے بخاری اور قدرت اللہ شہاب جیسی قد آور شخصیات سے ملنے کا اعزاز حاصل کر چکا تھا۔

''جب تمھیں بتا دیا ہے کہ کچھ بن جاؤ گے تو شادی کی بات بھی کر لینا پھر تمھارے دماغ سے یہ کیڑا کیوں نہیں نکل رہا''؟ امی نے میرے خیالات کا سلسلہ توڑا۔

''امی میں شادی کی بات کر رہا ہوں، شادی نہیں کر رہا''۔

''آخر کہنا کیا چاہتے ہو''؟ جیسے وہ کچھ نہ سمجھ پائی ہوں۔

''جب کچھ بن جاؤں گا تو شاید پھر مجھے رُخسانہ نہ ملے''۔ میں نے تمام ہمتیں جمع کر کے بالآخر کہہ ڈالا۔

امی جیسے سکتے میں آ گئیں۔ شاید اُنھیں مجھ سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ میں بھی ماحول کو مزید کشیدہ نہیں ہونے دینا چاہتا تھا سو اُٹھتے اُٹھتے ایک بات کی اور جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل آیا، ''ٹھیک ہے اگر آپ ماموں سے بات نہیں کرنا چاہتیں تو نہ سہی مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے لیکن پھر میں بھی یہ حق رکھتا ہوں کہ کہیں بھی اور کبھی بھی شادی نہ کروں''۔

تھوڑی دیر بعد ظفر بھی اوپر آ گیا اور آ کر مسکراتے ہوئے بولا ''یار تم نے آج کیسے اتنی ہمت پیدا کر لی؟ خالہ جی کہہ رہی تھیں کہ وہ تمھیں ہمیشہ ایک کھلنڈرا اور لا اُبالی لڑکا سمجھتی آئی

ہیں۔ کہہ رہی تھیں انھیں یقین نہیں تھا کہ کسی معاملے میں تم اس قدر سنجیدہ بھی ہو سکتے ہو"۔

میں نے کریدا، "اور کیا کہہ رہی تھیں"؟

ظفر بولا، "کچھ نہیں بس خاموش ہوگئی تھیں اور میں اجازت لیکر چلا آیا"۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ تیس پینتیس سال کی عمر تک میری طبیعت ہر معاملہ میں نہایت غیر سنجیدہ اور لاابالی ہوا کرتی تھی۔ میں خود حیران ہوں کہ رخسانہ کو پسند کرنے کے معاملے میں نے کیسے مستقل مزاجی دکھاڈالی۔ مستقبل کا پیشہ چننے کے بارے میں بھی میں ہمیشہ تذبذب کا شکار رہا۔ بچپن سے لیکر سکول کے زمانے تک پاکستان ایئرفورس میں پائلٹ بننا میرا خواب رہا۔ پھر ریڈیو اور راولپنڈی میں پاکستان ٹیلی وژن کی آمد کے بعد ٹی وی کے ڈراموں میں کام کرتے ہی مجھ پر فلمی دنیا میں قدم رکھنے کا بھوت سوار ہوگیا۔ یہاں تک کہ جوشِ جذبات میں والد صاحب کے دوست مشہور شاعر قتیل شفائی کو خط لکھ مارا کہ وہ مجھے اپنی فلم میں کام دیں۔ ان دنوں وہ اپنی فلم "اک لڑکی میرے گاؤں کی" کی تکمیل میں مصروف تھے جو بعد ازاں بوجہ ڈبوں میں بند ہوگئی۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ بات والد صاحب تک نہ پہنچتی لیکن خلاف توقع اباجی نے غصہ کرنے کے بجائے پاس بٹھا کر واضح الفاظ میں اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے کہا،

"برخودار! میں گھر سے سترہ برس کی عمر میں ناراض ہوکر نکلا تھا۔ اور پھر آگے ہی دیکھتا رہا واپس گھر نہیں لوٹا تمھارے پاس بھی اختیار ہے کہ گھر میں رہ کر تعلیم مکمل کرو اور اپنے وقت پر گھر چھوڑ دو یا ابھی فلموں کے شوق میں گھر سے نکل جاؤ لیکن دوسری صورت میں یہ دروازہ اندر کی جانب نہیں کھلتا۔ بس یہ خیال رکھنا"۔

میرے لئے اتنی نصیحت ہی کافی تھی چنانچہ فلمی ہیرو بننے کا شوق جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب پاک بھارت تعلقات نہایت کشیدہ تھے۔ نظر آرہا تھا کہ بھارت ستمبر ۱۹۶۵ء کی ذلت آمیز شکست کا بدلہ لینے کے لئے تُلا بیٹھا ہے۔ جذباتی طبیعت نے ایک اور پلٹا کھایا۔ اب وطن کی محبت آڑے آنے لگی اور اس خاکسار نے خاکی وردی پہننے کا فیصلہ کرلیا۔

پہلی دفعہ تمام مراحل طے کر کے کوہاٹ فائنل سلیکشن کے لئے گیا تو وہاں بھی غیر سنجیدگی کا خمیازہ بھگتا کیوں کہ فوج کو افسر درکار تھے اداکار نہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح رُخسانہ کو ہر مرحلہ پر اپنی ہر امتحان میں کامیابی سے آگاہ کرتا رہا۔ ظاہر ہے اسے اس فائنل امتحان آئی ایس ایس بی کے نتیجے کا بھی انتظار تھا۔ دل پر پتھر رکھ کر اپنی ناکامی کی اطلاع ماموں جی کو فون کر کے دی جنہوں نے تسلی دی کہ فکر نہ کرو اگلی دفعہ ان شاءاللہ ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔

اسی دوران ایک روز امی کا لاہور جانے کا پروگرام بنا مجھے علم تھا کہ وہ مجھے ساتھ نہیں لے کر جائیں گی۔ سو انھیں اکیلا پا کر اُن سے کچھ کہنے کا فیصلہ کیا۔ میں اُن کے قدموں میں بیٹھ کر بولا،

''امی آپ نے دیکھا ہے کہ میں زندگی کو سنجیدگی سے لے رہا ہوں (گو کہ آئی ایس ایس بی کا نتیجہ اس کی نفی کر رہا تھا)۔ میں کچھ بننا چاہتا ہوں''

امی میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئیں ''تو پھر''؟

''آپ اپنے بیٹے کی خواہش نہیں پوری کر سکتیں؟ کیا آپ ممانی جان سے رخسانہ کے لئے بات نہیں کر سکتیں؟ آپ نے ابھی صرف رخسانہ کا ہاتھ مانگنا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کچھ نہ بن سکا تو دوبارہ رخسانہ کا نام بھی نہیں لوں گا''

امی جی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور جیسے سب کچھ پڑھ لیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ میری آنکھوں کی غیر محسوس نمی کو میری ماں کی جہاندیدہ آنکھوں نے کیسے بھانپ لیا۔ اچانک ماں نے بیٹے کی خواہش کے سامنے ہتھیار پھینک دیئے۔ انھوں نے ہامی بھری اور میں اس ناقابل یقین بات پر جیسے سکتے میں آ گیا۔ آگے بڑھ کر ماں کو گلے سے لگا لیا۔ وہ بولیں، ''مجھے نہیں علم کہ تمھارے ماموں ممانی میرے سوال کو پذیرائی بخشیں گے یا نہیں لیکن مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ اگر انہوں نے ہامی بھر لی تو کچھ بن کے دکھانا اور ماں باپ کو شرمندہ نہ کرنا''۔

مجھے اگلا جھٹکا اس وقت لگا جب انھوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا! ایک ساتھ اتنی خوشیوں کا اچانک ملنا مجھ سے نہیں سنبھالا جا رہا تھا۔ اگلے روز ہم لاہور میں ماموں ریاض کے گھر پر موجود تھے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ اور بات بے بات پر کھلکھلا کر ہنسنا۔ تاہم رخسانہ محتاط مسکراہٹ کے ساتھ حسب روایت خاموش مگر ہمجولیوں کی تمام سرگرمیوں میں برابر کی شریک۔ میرا ایک چرمی بیگ ہوا کرتا تھا جسے میں ہر وقت ساتھ رکھا کرتا تھا۔ بیگ کیا تھا عمر و عیار کی زنبیل تھا جس میں دوستوں کے خطوط، چند قلم، میری ٹی وی اور اسٹیج ڈراموں کی تصویریں اور دیگر الم غلم موجود ہوتا۔ شام کو تصویریں دکھانے کے بہانے سب کو لے کر بیٹھا۔ رخسانہ کی خالہ زاد اور ہم عمر دردانہ اشرف بھی ان کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ نہایت ملنسار اور خوش اخلاق زندگی میں آگے چل کر دُردانہ سے میرا بہن بھائی والا رشتہ بیحد مضبوط ہوتا چلا گیا جو الحمدُ للہ اب تک قائم ہے۔ دردانہ کو، جسے سب پیار سے داناں کہتے تھے میری ہمراز بننے میں قطعی دیر نہ لگی۔ اسی شام ہم سب بیٹھے تصویریں دیکھ رہے تھے اور داناں میری کچھ تصویریں خاص طور پر رُخسانہ کو دکھا رہی تھی کہ ایک موقع پر میں نے نوٹ کیا کہ رخسانہ کی نظریں مجھ سے غیر ارادی طور پر ٹکرائی ہیں۔ وہ یوں گھبرائی جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ اگلے روز صبح فاروق اور میں گھر پر ہی تھے جبکہ رخسانہ اور دیگر بچے سکول کالج جا چکے تھے۔ امی، ممانی کے ساتھ رسوئی میں تھیں جہاں موقع پا کر انہوں میرے لئے رخسانہ کا ہاتھ مانگ لیا۔ ممانی جان کے لئے یہ کوئی بریکنگ نیوز نہ تھی۔ کیونکہ اس وقت تک انھیں 'میری پسند' کے بارے میں خاصی معلومات فراہم کی جا چکی تھیں۔ تاہم حسب توقع ممانی جان نے انکار تو نہ کیا البتہ دو باتیں ضرور کہیں۔ وہ امی کو باجی کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھیں۔ بولیں، ''باجی! آپ ہی کی بیٹی ہے لیکن سہیل کچھ بن تو لے اور ویسے بھی ریاض سے پوچھے بنا میں کیسے ہاں کر سکتی ہوں''؟

امی نے اتفاق کیا اور ماموں کی بنک سے واپسی کا انتظار کیا جانے لگا۔ دردانہ کو تمام پیش رفت کا علم تھا سو وہ اس روز گھر جانے کے بجائے اسلامیہ پارک ہی رک گئی اور صبح کی پکن

میٹنگ کی ساری رپورٹ مجھے فراہم کردی۔ مجھے اب بے صبری سے شام کا انتظار تھا کہ دیکھیں میری قسمت کا کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں بڑھتی جبکہ دل کی دھڑکنیں گھٹتی جا رہی تھیں۔ ماموں ریاض نہایت کم گو، سنجیدہ اور بارعب شخصیت تھے۔ خاندان والوں نے انہیں دوستوں کی محفلوں کے علاوہ بہت کم ہنستے اور خوش گپیاں کرتے دیکھا تھا۔ دن بھر ذہن میں مختلف خیال آتے رہے۔ کسی وقت تو وہم اٹھتا کہ وہ غصے میں لال پیلے ہو کر سیدھا سیدھا انکار کردیں گے، لیکن جب ان سے پہلی ملاقات، جس میں انھوں نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ والہانہ انداز میں مجھے سینے سے لگایا تھا، یاد آتی تو مجھے کچھ تسلی ہو جاتی۔ اللہ اللہ کر کے شام کا وقت آیا۔ بزرگ ڈرائنگ روم میں اکھٹے ہوئے۔ ممانی جان، ماموں کو مختصراً ماجرا بیان کر چکی تھیں کہ باجی کے دورے کا مقصد کیا ہے۔ سب کا تجسس اور اشتیاق قدرتی امر تھا۔ سو دبے پاؤں ساتھ والے کمرے میں جا پہنچے جہاں سے ڈرائنگ روم میں ہونے والی گفتگو باآسانی سنی جا سکتی تھی۔ امی نے سوال دہرایا کہ ریاض میں اس قابل تو نہیں ہوں اور نہ ہی میرا بیٹا ابھی اس قابل ہے کہ سوال کرسکوں لیکن اس ڈر سے کہ کہیں دیر نہ ہو جائے میں تم سے سہیل کے لئے رخسانہ کا ہاتھ مانگتی ہوں۔ ماموں نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا "باجی! آپ میرے لئے ماں کی جگہ ہیں۔ میں آپ کے کسی بھی حکم سے انکار کا سوچ بھی نہیں سکتا لیکن کیا یہ بات ذرا جلدی نہیں کیونکہ آپ بھی جانتی ہیں کہ طویل عرصہ کی منگنی اکثر پیچیدگیوں کا باعث بنتی ہے۔ امی نے بھائی کی بات سے اتفاق کیا لیکن ساتھ میں وجہ بھی دُہرادی۔

ماموں ریاض بولے، "مجھے سہیل بہت پیارا ہے۔ اس کو میں نے آج کے بچوں سے منفرد پایا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایک روز بہت نام پیدا کریگا اور میں اسی یقین کی بنیاد پر آپ کو ہاں کہتا ہوں۔

ماموں مجھے اس قدر پیار کرتے ہیں؟ اور انہوں نے اتنی آسانی سے مجھے فرزندی میں قبول کرلیا؟ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ یوں لگا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ دردانہ

نے مجھے جھنجھوڑا تو ہوش آیا۔ مجھے مبارک دے کر وہ رُخسانہ کو ڈھونڈ نے گھر کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ کہ اسے بھی خبر سُنائے۔ تھوڑی دیر بعد میری بزرگوں کے سامنے پیشی ہوئی۔ لیکن یہ خبر دینے کے لئے نہیں بلکہ ماموں میرے مستقبل کے ارادے پوچھنے لگے۔ جب میں نے بتایا کہ فوج میں جانے کا عزم ہے تو انہوں نے تاکید کی کہ خواہش کے ساتھ محنت ضروری ہوتی ہے۔ اگلی صبح ہم نے واپس پنڈی آنا تھا۔ دردانہ نے رخسانہ کو سکول جانے سے روک لیا۔ ایک مخلص دوست کی طرح وہ چاہتی تھی کہ ہماری ملاقات ہوجائے۔ رخسانہ ایک نئے روپ میں میرے سامنے تھی۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اُسے اپنی منگیتر کہہ سکتا ہوں۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ اس دفعہ کامیاب نہیں ہوا لیکن اگلی دفعہ ان شاًاللہ ضرور فوج کے لئے سلیکٹ ہو جاؤں گا۔

رُخسانہ نے مخصوص شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا،

''ہاں اگر اگلی بار سنجیدگی اور متانت کا مظاہرہ کیا تو ان شاًاللہ آپ چُن لئے جائیں گے''۔

یہ میرے لئے ایک طعنہ بھی تھا اور چیلنج بھی جس نے میری آنے والی زندگی کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ وقت تیزی سے گزرنے لگا۔ بھارت کی مشرقی پاکستان میں ریشہ دوانیاں بڑھنے لگیں اور پھر وطن عزیز پر جنگ کے مہیب بادل چھانے لگے۔ حالات نے میرے جوش و جذبے کو مہمیز دکھائی اور میں نے اس بار نہایت سنجیدگی سے فوج میں شمولیت کے لئے دوبارہ قسمت آزمائی کا فیصلہ کرلیا۔ مختلف مراحل سے کامیابی کے بعد ایک بار پھر آئی ایس ایس بی کا مرحلہ آیا لیکن اس بار میں منتخب ہونے کے لئے پرعزم تھا۔ دوسری جانب جنگ شروع ہوچکی تھی اور بھارتی طیاروں کے ہوائی حملوں کے دوران میں نے آئی ایس ایس بی کے لئے کوہاٹ کا سفر اختیار کیا اور انہی حملوں کے دوران چار روزہ امتحانات کامیابی سے مکمل کر کے گھر واپسی کا سفر اختیار کیا۔ ملٹری اکیڈیمی کاکول جوائن کرنے کی تاریخ سے متعلق سرکاری چٹھی کوہاٹ میں ہی ہم لوگوں کے حوالے کردی گئی تھی۔ ہمیں ہنگامی طور پر کاکول رپورٹ کرنا تھی۔

میری شدید خواہش تھی کہ میں ذاتی طور پر لاہور جا کر رُخسانہ کو یہ بریکنگ نیوز سناتا لیکن ملکی حالات، جنگ کا سماں اور قلیل وقت، سب آڑے آئے اور مجھے اپنی یہ خواہش دل میں لئے کاکول جانا پڑا۔ البتہ جانے سے قبل میں نے رخسانہ کو ایک الوداعی خط لکھا جس میں اپنی کامیابی کی خبر دی۔

ملٹری اکیڈمی کاکول میں رپورٹ کئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ جنگ بندی کے ساتھ ساتھ پاکستان بھی دولخت ہو گیا لیکن اس سے تربیت کی روزمرہ زندگی پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اکیڈمی کی تیز تر اور ہنگامہ خیز زندگی سب کچھ بھلا دیتی ہے لیکن کڑی تربیت میرے ذہن سے رخسانہ کو ایک لمحہ کے لئے بھی محو نہ کر سکی۔ میں نے اپنے کمرے کی کارنس پر اس کی تصویر فریم کرا کے رکھ لی تھی جو مقصد کی تکمیل کی خاطر میرے لیے مہمیز ثابت ہوئی۔ اُس تصویر کو آتے جاتے دیکھتا۔ تربیت کے دوران رخسانہ، فاروق، ممانی جان کا دو دفعہ کاکول آنا ہوا لیکن میری قسمت کہ تربیتی مشقوں کے لیے اکیڈمی سے باہر ہونے کی وجہ سے میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ہر دفعہ واپسی پر جب مجھے اس بارے علم ہوتا تو میں شدید مایوسی کا شکار ہوتا۔ اللہ اللہ کر کے تربیت کی تکمیل کا دن آ گیا۔ میری دوران تربیت رخسانہ سے ملاقات تو نہ ہو سکی تاہم خط و کتابت باقاعدہ ہوتی رہی۔ میں اسے اپنے تربیتی لمحات کی تصاویر نہایت تواتر سے بھیجتا رہتا جن میں سے کبھی کوئی تصویر طنز کا شکار ہوتی تو کبھی کسی فوٹو کا کھلم کھلا مذاق اُڑایا جاتا۔ دراصل تربیت کے دوران اکیڈمی انسان کا حلیہ ہی ایسا کر دیتی ہے کہ بندہ بعد از تربیت اگر خود بھی اپنی تصویریں دیکھے تو سر پیٹے یا مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

رخسانہ، ممانی جان کے ساتھ پاسنگ آؤٹ کی مبارک باد دینے خاص طور پر راولپنڈی آئی اور تحفے میں میرے لئے ایک خوبصورت قمیص بھی لائی۔ ان تحفے تحائف کے تبادلوں کا سلسلہ میرے اکیڈمی جانے سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا اور مجھے رخسانہ کی دی ہوئی ہر چیز جان سے زیادہ عزیز تھی۔ حسنِ اتفاق دیکھئے کہ کمیشن ملنے کے بعد میری پہلی تعیناتی میں

لاہور میں واہگہ کی سرحد پر مورچہ زن پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین میں ہی ہوئی۔ یقیناً آپ میری خوشی دوچند ہونے کی وجہ سمجھ سکتے ہیں۔ میں اب سکینڈ لیفٹیننٹ سہیل پرواز تھا جسے ہر نوجوان فوجی افسر کی طرح وردی کے غرور کے علاوہ اس بات پر بھی فخر تھا کہ وہ مشرقی حسن و حیا کی مالک ایک عدد دوشیزہ کا منگیتر بھی تھا۔ میں زندگی کے سفر میں ایک اور منزل الحمدللہ کامیابی سے طے کر چکا تھا اور وقت نے مجھے رخسانہ کے مزید قریب کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆
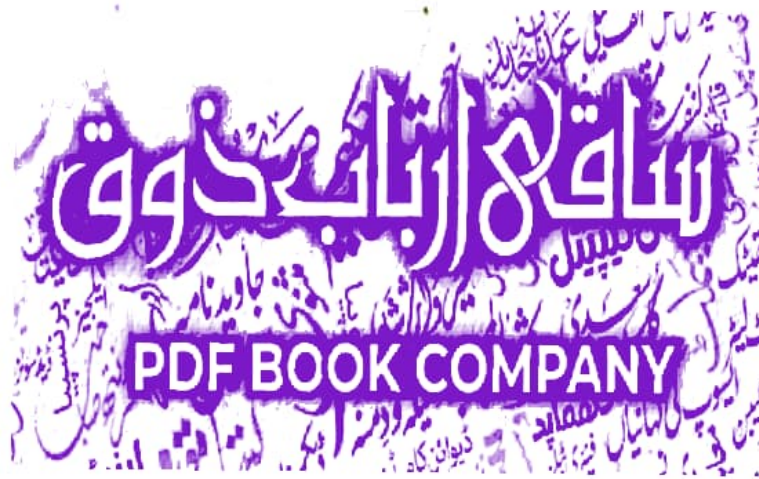
رُخسانہ میں آ رہا ہوں!

ستر کی دھائی، گذشتہ صدی کی سب سے ہنگامہ خیز دھائی گنی جاتی تھی۔ بہت سے اہم عالمی واقعات نے جنم لیا اور تاریخ کے اوراق کا ناقابلِ فراموش حصہ بنے۔ کئی مغربی و مشرقی گلوکاروں نے لازوال گانے گا کر نام کمایا، فیشن کی دنیا نے نئے نئے رجحانات متعارف کروائے۔ پاکستان میں رنگین ٹیلی وژن کی آمد ہوئی۔ ستر کی دھائی دراصل وہ عشرہ تھا جب بین الاقوامی حالات نے قیامت خیز کروٹ لی۔ بہت سے اہم بین الاقوامی مسائل اور معاملات رنگین سے بلیک اینڈ وائٹ اور بلیک اینڈ وائٹ سے رنگین ہوئے۔ کہیں مشرق وسطی میں تیل کا بحران تو کہیں حرم شریف میں خارجیوں کا فتنہ، لہولہان کشمیر یا پھر لبنان کی خونریزی۔ برصغیر میں چالباز اور مکار ہمسائے بھارت کی ریشہ دوانیوں کے سبب اور کچھ ہماری اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ کہ پاکستان دولخت ہوا۔ افغانستان میں اشتراکیت کے خلاف علم بغاوت بلند ہوا۔ بحثیت ایک چوکنے سپاہی کے میرے لئے یہ سب واقعات بیحد اہم تھے لیکن میری زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑنے والا واقعہ، رخسانہ کی میری زندگی میں آمد تھی۔ رخسانہ کا معصوم چہرہ، شوخ وچنچل نگاہیں اور دلفریب مسکراہٹ مجھے اپنی زندگی کا لازوال خزانہ محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے خود کو دنیا کا سب سے دولتمند شخص سمجھنا شروع کر دیا اور بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔

اوپر سے میری خوش قسمتی کہ پہلی تعیناتی ہی ''سسرائیل'' (کسی کے بھی سسرالی شہر کو

میں از راہ تفنن یہی کہتا ہوں) میں ہوئی۔ ویک اینڈ پر پنڈی کا چکر لگانا تو مشکل ہوتا تھا سو کبھی ہفتہ کی شام اور کبھی اتوار کی صبح ماموں ریاض کے ہاں اسلامیہ پارک جا دھمکتا تھا۔ سب کزنز وہاں اکھٹے ہوتے تھے خوب دھما چوکڑی مچا کرتی تھی۔ ماموں دوستی یاری رکھنے والے انسان تھے سو چھٹی کا دن اکثر دوست احباب کی محفل میں گذارتے۔ اس وقت بھی ہفتہ وار چھٹی اتوار ہی کو ہوا کرتی تھی۔ کبھی وسیع و عریض صحن میں کرکٹ کا میچ ہوا کرتا تھا تو کبھی ڈرائنگ روم میں کیرم بورڈ، شطرنج یا تاش کی بازی لگتی۔ رخسانہ سے دن میں دو چار بار ملاقات ہو جاتی اور میرے لئے یہی غنیمت ہوتا۔ اس دوران میرے سر میں باقاعدہ منگنی کا شوق سمایا۔ ظاہر ہے کہ جب سب دوست احباب اپنی اپنی منگیتروں کی باتیں کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا بڑھا کر انگوٹھیاں دکھاتے تو میری ''معصوم جان'' احساسِ محرومی کا شکار ہو جاتی۔ اداکاری میں پہلے ہی مہارت تھی۔ خیر بات منگنی کی ہو رہی تھی۔ تھوڑی سی جذباتی اداکاری کے بعد میں نے امی کو قائل کر لیا۔ دونوں طرف سے ہلکی پھلکی تیاریاں ہوئیں اور ۴؍مئی ۱۹۷۴ء کو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو انگوٹھیاں پہنائیں اور ہماری باقاعدہ منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔

گو زندگی نے خفیف سا لیکن خوبصورت پینترا بدلا تھا لیکن انسان بھی کیا عجیب شے ہے، جس چیز کی طلب رکھتا ہے اس کے لئے تگ و دو کرتے ہوئے مستقبل کی قطعی نہیں سوچتا لیکن جونہی اس مقصد کا حصول ہو جاتا ہے تو یکا یک اگلی منزل کے خواب دیکھنے شروع کر دیتا ہے۔ ایسا ہی کچھ حال اس خاکسار کا بھی تھا۔ منگنی ہوئی نہیں تھی کہ ڈھول، باجے کی آوازیں سوتے جاگتے ستانے لگیں۔ دل چاہتا تھا کہ وقت کو پر لگ جائیں اور اگلی ہی صبح میں سہرا باندھ کر (جی ہاں اس زمانے میں سہرا باندھا جاتا تھا اور انکار کرنے والا بچہ گستاخ گردانا جاتا تھا) ملک ریاض صاحب کے گھر کا رخ کروں۔ کیا خوبصورت دن تھے کہ پانچ سو روپوں میں امیر زادوں کی طرح گزارہ کیا کرتے تھے۔ اور پیسے میں اتنی برکت کہ مہینے کے آخری دنوں میں پھوکٹ اور فضول خرچ دوستوں کی مدد بھی کر دی جاتی۔ فی زمانہ پیسے کی برکت تو اُڑی سو اُڑی

لیکن نیتّوں میں بھی بے حد کھوٹ آ گیا ہے۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ بحیثیت سیکنڈ لفٹیننٹ میری تنخواہ پہلے پانسو اور چند ماہ بعد ساڑے پانچ سو ہوگئی۔ اس تنخواہ میں کبھی کبھار والدہ کو بھی کچھ بھیج دیا کرتا تھا، میس کے کھانے کا بل، لاہور کے تمام سینما گھروں پر لگنے والی اردو، انگریزی، پنجابی فلمیں اس زمانے کے مشہور ہوٹلوں پر کھانا، پرانی انارکلی کی کون آئس کریم، پسند کے کپڑے بنوانا و دیگر فضول خرچیاں، مگر مہینے کے آخر میں پھر بھی کچھ نہ کچھ بچ جاتا تھا۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن سچ یہی ہے جو آج تنتالیس سال بعد مجھے بھی ایک سہانا خواب لگتا ہے۔ لیکن میرے عہد کے دوست یقیناً میری تائید کرینگے۔ بھلا وقت تھا جب سونا بھی دو ڈھائی سو روپے تولہ ہوا کرتا تھا۔ اب ایسے میں ایک نوجوان لفٹین کو شادی کی نہ سوجھتی تو اور کیا سوجھتا؟

بیس، بائیس برس کی عمر ملے جلے جذبات کی عمر ہوتی ہے۔ اگر اس عمر میں بروقت انسان کچھ بن جائے تو وہ خوامخواہ خود کو ہیرو تصور کرنے لگتا ہے۔ اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ دنیا نہیں تو کم از کم عزیز و اقارب اسے ہیرو ضرور سمجھیں۔ اور پھر خاکی وردی پہننا تو ویسے ہی ایک اعزاز تھا اور ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ تازہ تازہ ختم ہوئی تھی اور سقوطِ ڈھاکہ کے زخم بھی ہرے تھے جس کی جھلک فوجی یونٹوں، آرمی میسوں اور افسروں، نوجوانوں کے چہروں پر دیکھی اور پڑھی جاسکتی تھی۔ میری پلٹن ان دنوں واہگہ بارڈر پر متعین تھی اور ابھی فوج کی چھاؤنیوں کو واپسی نہیں ہوئی تھی۔ ایک روز خیال آیا کہ کیوں نہ رُخسانہ کو واہگہ بارڈر اور اپنی یونٹ کی سیر کرائی جائے۔ طریقہ واردات یہ اختیار کیا کہ ماموں کو بھی دعوت دے ڈالی۔ معلوم تھا کہ وہ کبھی نہیں آئیں گے لیکن ان کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہ رہے گی۔ ممانی جان قافلہ سالار مقرر کی گئیں اور یوں رُخسانہ کوئی چھ عدد افرادِ خانہ کے ہمراہ اگلے مورچوں کے ''معائنے'' کے لئے وارد ہوئی۔

کمانڈنگ آفیسر سے ضروری اجازت پہلے ہی حاصل کر لی تھی۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کہ میں رُخسانہ کو بمعہ ''سسرالی نمائندوں'' کے اگلے مورچے دکھا رہا تھا۔ شام ڈھلی تو

واہگہ چیک پوسٹ پر جھنڈا اُتارنے کی تقریب دکھانے لے گیا۔ اور رات کو فوجی میس کا کھانا کھلا کر ان لوگوں کو ہنستے کھیلتے واپس رخصت کیا۔ وہ دن میرے لئے ایک یادگار دن تھا۔ بہت سا وقت میں نے رخسانہ کے ساتھ گزارا اور اسی دوران میری سوچوں نے زقند لگائی اور میں نے رخسانہ کو اپنے ساتھ فوج کی زندگی میں مصروف پایا۔ یہ ایک سہانا سپنا تھا جو جلد ہی پورا ہونے جا رہا تھا۔

وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا اور پھر اچانک ہماری یونٹ کے لاہور سے آزاد کشمیر کے کسی مقام پر تبادلے کے احکامات آ گئے۔ یہ غالباً ۱۹۷۵ء کے اوائل کی بات ہے۔ مجھے قدرتی حسن اور خصوصاً پہاڑوں سے ہمیشہ عشق رہا ہے۔ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی کشمیر جانے کی انجانی خوشی بھی تھی تو لاہور چھوڑنے کا دکھ بھی۔ وہی لاہور جو میری جنم بھومی تھا جس کی رونقوں میں، میں نے بچپن گزارا تھا۔ جہاں نور محلہ اندرون بھاٹی دروازہ، میں نے آنکھ کھولی تھی اب خاکی وردی پہن کر پہلی پوسٹنگ بھی وہیں ہوئی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری رخسانہ اسی شہر میں رہتی تھی۔ جوں جوں روانگی کے دن نزدیک آ رہے تھے اُداسی بڑھتی جا رہی تھی میں شروع ہی سے شرارتی اور بیباک تھا سو اپنی اداسی کا اظہار کر لیا کرتا تھا لیکن رخسانہ کی اداسی فقط اس کی گہری آنکھوں میں ہی پڑھی جا سکتی تھی۔ دردانہ اُسے اکثر چھیڑا کرتی اور ساتھ ہی تسلی بھی دے دیتی کہ کوئی نہیں بس تھوڑی ہی دیر کی تو بات ہے۔

اور پھر وہ دن آ گیا جب ہمیں لاہور چھوڑ کر کشمیر کے لئے روانہ ہونا تھا۔ آرمی اسپیشل ٹرین نے ہمیں نزدیکی ریلوے اسٹیشن تک پہنچانا تھا جہاں سے ہمیں فوجی کانوائے کی صورت میں اپنے ذمہ داری کے علاقے تک پہنچنا تھا۔ میں وہ یادگار دن کبھی نہیں بھول سکتا جب لاہور ریلوے اسٹیشن سے رات کو ہماری اسپیشل ٹرین روانہ ہوئی۔ باقی گھر والوں کے ساتھ رخسانہ بھی اسٹیشن پر آئی لیکن شومئے قسمت کہ آنکھ سے آنکھ اس وقت ملی جب گارڈ سیٹی بجا چکا کر ہری جھنڈی لہرا چکا تھا۔ مجھے رخسانہ کا شدت سے انتظار تھا۔ رنگوں کا فرق مٹتا محسوس ہوا۔ یوں لگا

جیسے گارڈ ہری نہیں بلکہ سرخ جھنڈی دکھار ہا ہو۔اور پھر اچانک رینگتی ٹرین کے دروازے میں کھڑے ہوئے مجھے رخسانہ، فاروق، دردانہ اور بچے دور ہاتھ ہلاتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے بھی وفور جذبات میں شدت سے ہاتھ ہلانا شروع کر دیا لیکن رخسانہ کا الوداعی ہاتھ ہلانا میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا۔ گاڑی پلیٹ فارم سے نکلی، میں دور تک انھیں دیکھتا رہا اور رفتہ رفتہ ان کے چہرے دھندلانے لگے۔ میں بوجھل انداز میں اداس واپس آکر سیٹ پر بیٹھ گیا ساتھی افسران کو موقع ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے میری ''کِٹ'' لگانا شروع کر دی۔ چوبیس گھنٹے بعد ہم کشمیر میں اپنی منزل مقصود پر پہنچنے والے تھے۔ بلند پہاڑوں، خاموش چیڑوں اور سرسبز وادیوں نے یکا یک مجھے اپنے سحر میں گرفتار کر لیا لیکن میں رخسانہ کو نہیں بھولا۔ میں جس طرف دیکھتا مجھے وہی نظر آتی اگلے روز امی ابا جی کو خط لکھنے کے ساتھ ساتھ رخسانہ کو بھی بخیریت پہنچے کا خط لکھ ڈالا جس میں ورڈز ورتھ کی شاعری کو مات دیتے ہوئے، قدرتی حسن کی شان میں لمبے چوڑے قصیدے بھی لکھ مارے۔ اب زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی تھی۔ کشمیر کے اگلے مورچوں پر سرحدوں کی نگہبانی ایک حسین اور نا قابلِ بیان تجربہ تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ لاہور میں رخسانہ سے ملاقات کے دوران مجھے ماموں جان کے چھاپے کا ڈر لگا رہتا تھا لیکن یہاں ایسا کوئی ڈر نہ تھا رخسانہ ہر وقت میرے ساتھ ہوتی تھی۔ اس خوبصورت احساس نے رخسانہ کے لئے میری محبت کو مہمیز دکھا دی تھی۔

کشمیر سے چھٹی پر گھر آنا ایک کٹھن مرحلہ ہوا کرتا تھا۔ ہر ایک ماہ بعد چار دن کی چھٹی ملتی تھی جس میں سے دو دن سیدھے سیدھے آنے جانے میں خرچ ہو جاتے۔ اور پیچھے رہ جاتی کل دو دن کی چھٹی ؛ ایک دن گھر پہنچے کی خوشی اور دوسرا دن واپسی کے سفر کا بخار۔ یہ چھٹی اتنی وافر نہیں ہوتی تھی کہ لاہور اور راولپنڈی دونوں بھگتا لئے جاتے، کجا کہ سیدھا لاہور جانے کا سوچتا۔ ایسے خیال سے تو روح بھی کانپ جاتی تھی۔ امی کا پر جلال چہرہ آنکھوں کے سامنے کوندے کی طرح لپکتا اور دل کی حسرت گلِ نرگس کی طرح مرجھا جاتی۔ غالبا کشمیر پہنچنے کے بعد

یہ پہلی یا دوسری چھٹی تھی کہ گھر جا کر دبے لفظوں میں امی سے شادی کی بات کی۔ حسبِ دستور امی نے پہلے تو سرے سے ہی اس خیال کو ویٹو کر دیا۔ بھلا ہو ابا جی کا جنہوں نے میرا ساتھ دیا۔ ابا جی ایسے لاڈ کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کا ساتھ خاندان کے اہم فرد اور امی کے منہ بولے بھائی ماموں صابر منہاس نے دیا۔ ایک دن بحث مباحثہ میں گزر گیا لیکن میری چھٹی کا حاصل امی جان کی اس بات پر رضامندی تھی کہ وہ اپنے بھائی ملک ریاض سے اس بارے بات کرینگی۔ عام زندگی کے نوجوان کے بارے میں، میں نہیں کہہ سکتا کہ شادی کی بات چلنے پر ان کے کیا جذبات واحساسات ہوتے ہیں لیکن اپنی شادی کے لئے الٹی گنتی شروع ہونے پر ایک نوجوان فوجی کے کیا جذبات ہوتے ہیں، وہ یا تو صرف کوئی کنوارہ یا نیا نویلا شادی شدہ فوجی ہی بتا سکتا ہے یا پھر آپ مجھ سے پوچھئے۔ جس کے پاؤں زمین پر ٹکنے کا نام نہ لیتے تھے۔

اس وقت پلٹن میں غالباً دو یا تین سینئر افسران شادی شدہ تھے جن میں کرنل صاحب اور دو میجر صاحبان شامل تھے۔ باقی تمام افسران جن میں سے پانچ چھ مجھ سے سینئر اور دو جونیئر غیر شادی شدہ، کنوارے یا فوجی اصطلاح میں ''چھڑے چھانٹ'' تھے۔ ایسے میں، میں تاریخ رقم کرنے جا رہا تھا۔ خیر یونٹ پہنچ کر نہایت فخر سے ہمراہی افسران کو اپنی (ہنوز دلی دور است) خانہ آبادی کی خبر دی۔ یہ وہ خبر ہوتی ہے جو ایک کنوارہ فوجی، شادی کی تیاریاں شروع ہوتے ہی، کسی طوطے کی طرح اُٹھتے بیٹھتے ہر جانے انجانے خاکی وردی والے ہمراہی سے کہتا پھرتا ہے۔ (I am getting married) میں شادی کرنے جا رہا ہوں۔ خوشخبری کا پہلا خط رخسانہ کو لکھا کہ امی کو تیار کر لیا ہے وہ عنقریب ماموں ریاض سے شادی کی بات کرنے آئینگی۔ خوشی تھی کہ سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ رخسانہ کے بعد دردانہ کو بھی خط لکھ مارا اور تاکید کی کہ مجھے حالات سے باخبر رکھنا۔ ہر دوست عزیز کو اطلاع دینا ضروری سمجھا، گویا خط نہ ہو گیا کسی اہم بین الاقوامی واقعہ کے رونما ہونے پر ضمیمہ شائع کیا جا رہا ہو۔ یقیناً آپ میری اس یادداشتوں کے مجموعہ کو پڑھ کر اسے ہیر رانجھے یا سوہنی مہینوال کی محبت کی داستانوں سے تشبیہہ دینگے اور بات ہے بھی

کچھ ایسی ہی۔ کامیاب ازدواجی زندگی کے سفر میں جب ساتھیوں میں ہم آہنگی ہو جائے تو وہ محبت کی داستان سے کم نہیں ہوتی۔

رخسانہ سے خط و کتابت میں بھی تیزی آگئی۔ خوبصورت وقت تھا، رابطے مصنوعی ذریعوں کے محتاج نہیں ہوا کرتے تھے۔ کمپیوٹر، آئی پیڈ، اور موبائل فون جیسی چیزوں کے کبھی نام بھی نہیں سُنے تھے۔ کاغذ پر تحریر کئے گئے ایک ایک لفظ سے حقیقت کا اظہار ہو جایا کرتا تھا کہ تحریر خلوص میں ڈوبی ہے یا ریا کاری کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ادھر میں خط لکھتا اور ادھر اس کے جواب کا انتظار شروع کر دیتا۔ ہم نے لکھنا بھی کیا ہوتا تھا؟ اللہ ہم پر مہربان تھا اور محبت ہم دونوں نے پالی تھی۔ بس اب تو جس گھروندے کا خواب ہم نے دیکھا تھا اس کی منصوبہ بندی کے لئے ''پتر کاری'' کی جاتی تھی۔ ہم یوں کرینگے، ہم یوں کرینگے، ایسا کریں گے اور ویسا کریں گے۔ آفس سے آنے کے بعد شام کو اکھٹے گھومنے پھرنے نکلا کرینگے۔ اور نہ جانے کن کن خوبصورت خوابوں کا تبادلہ کیا کرتے۔ پلک جھپکنے میں وہ چار پانچ ماہ گزر گئے۔ اور پھر ایک دن گھر سے اطلاع آئی کہ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۵ء بروز بدھ شادی کی تاریخ طے پائی ہے۔ مارے خوشی کے دل بلیوں اچھلنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے انعامی بانڈ نکل آیا ہو۔ ہر ایک کو اطلاع دیتا پھر رہا تھا۔ وہ تو ایک سینئر آفیسر کا بھلا ہو جس نے ہاتھ ہولا رکھنے کو کہا اور نصیحت کی ''مائی ڈیر! ہنوز دلی دور است''۔

میں نے معصومانہ انداز میں پریشان ہو کر پوچھا ''سر! وہ کیسے''؟

تو انھوں نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی کہ ابھی تو تم کمانڈنگ آفیسر سے چھٹی کی درخواست کرو گے اور چھٹی منظور ہونے کے بعد ہی تم شادی کے لئے جا سکو گے۔ میں ایک نوجوان جوشیلا لفٹین تھا جس کا خیال تھا کہ انسان فیصلہ کر لے تو باقی کام خود بخود ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ پہلا خفیف جھٹکا تھا۔ فوج کی زندگی کا ایک خوبصورت پہلو پلٹن میں افسروں کا ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا (مذاقاً) بیوقوف بنانا، مختلف مواقع پر ایسے ڈرامے کرنا کہ ان پر

حقیقت کا گمان ہو، ایک معمول کی بات ہوتی ہے۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ چند روز بعد یونٹ سرمائی مشقوں کے لئے فیلڈ ایریا میں نکل رہی تھی، میں نے سینئر کی نصیحت کے مطابق چھٹی کی درخواست دے ڈالی۔ دفتری اوقات ختم ہونے پر چھٹی کا رجسٹر باہر نکلا تو سی او کے ریمارکس دیکھ کر ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

لکھا تھا ''فی الحال چھٹی نہیں دی جا سکتی، یونٹ مشقوں پر جا رہی ہے'' یوں لگا جیسے خوابوں کا محل زمین بوس ہو گیا ہو۔

وہی سینئر ہمدردانہ انداز میں بولے۔ ''فکر نہ کرو کچھ کرتے ہیں''۔

اگلے روز رخسانہ کا خط بھی مل گیا جس میں تاریخ طے ہونے کی خوشخبری تھی۔ مگر یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اس کا خط پا کر کوئی خوشی نہ ہوئی۔ پہلے سوچا جواب دے ہی ڈالوں کہ یہاں تو معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا ہے، لیکن نہ جانے کیوں پھر ارادہ ترک کر دیا۔ کشمیر کی بلند و بالا خوبصورت چوٹیاں اور چیڑ کے طویل قامت درخت مجھے زہر لگنے لگے۔

شادی کا کارڈ جو میں نے خود ڈیزائن کیا تھا وہ بھی بے دلی سے ابا جی کو پنڈی بھجوا دیا۔ دل میں کہیں ایک موہوم سی اُمید تھی کہ ہو نہ ہو چھٹی مل ہی جائے گی۔ ابا جی کے دوست مشہور شاعر بشیر منذؔر مرحوم کا ایبک روڈ لاہور پر طباعت خانہ المینار آرٹ پریس کے نام سے ہوا کرتا تھا۔ اور شاید اب بھی ہو۔ انھوں نے نہایت محبت سے میرا ڈیزائن کردہ کارڈ چھاپنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ اپنی خوش باش اور ہنس مکھ طبیعت کی وجہ سے وہ مجھے بہت پسند تھے۔ انہی کے پریس میں مجھے درویش منش شاعر ساغؔر صدیقی مرحوم سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ جنہوں نے کھڑے کھڑے میرا نام پوچھ کر میرے لیے دعائیہ نظم لکھ ڈالی۔ کارڈ تو بھیج دیا لیکن چھٹی کا گھمبیر مسئلہ میرے بھیجے میں پھنس کر رہ گیا۔ چند روز بعد پلٹن ایکسر سائز کے لئے نکل گئی۔ مشقوں کے علاقے میں تمام سینئر افسران مجھے دیکھ کر معنی خیز نظروں سے مسکراتے اور فقرے چست کرتے۔ کوئی کہتا اس بیچارے کی تیاری دھری رہ جائے گی، تو کسی کا خیال ہوتا

کہ اسے شادی ایک ماہ آگے کر دینی چاہیے۔ میں سب کچھ سنتا اور صبر شکر کر کے رہ جاتا۔

ایک روز مشقوں کے دوران گشت کا قرعہ میرے نام نکلا۔ ایڈ جوٹنٹ نے کہا،

''آج لڑاکا دستے یعنی فائٹنگ پٹرول (Fighting Petrol) کے ساتھ تم دشمن کے علاقے میں جاؤ گے۔ اور کوشش کرو گے کہ دشمن کے کسی سپاہی کو قید کر کے بھی لاؤ''۔ خیر رات کو تمام کارروائیاں پوری کر کے میں لڑاکا دستہ لیکر نکل پڑا۔ باقی مشن مکمل ہوا لیکن کوئی قیدی نہ مل سکا اور یوں صبح کاذب کے وقت واپسی ہوئی۔ معمول ہوتا تھا جو دستے رات کی کارروائیوں کے بعد واپس آتے انہیں الصبح بریفنگ دینی ہوتی تھی اور کرنل صاحب اس موقع پر خود موجود ہوتے تھے۔ میں اپنی باری پر بریفنگ دے چکا تو کمانڈنگ آفیسر لیفٹننٹ کرنل سید امتیاز حسین بخاری جو ایک بذلہ سنج انسان ہیں اور اللہ انہیں سلامت رکھے، بولے،

''یہ اچھا شگون نہیں کہ تم دشمن کے کسی سپاہی کو قید کر کے نہیں لا سکے۔ بہر حال میں تمہیں ایک اور موقع دیتا ہوں لیکن اس دفعہ تم دشمن کے علاقے میں اکیلے جاؤ گے اور بہر صورت اسیرِ جنگ کے ساتھ واپس آؤ گے''۔

میں ہکا بکا ان کا منہ دیکھنے لگا کہ یا اللہ آج تک اکیلا آفیسر یا جوان تو کبھی کسی مشن پر نہیں گیا لیکن یہ میرے ساتھ کیسی دشمنی ہو رہی ہے؟ پہلے چھٹی نہیں دی اب مشقوں میں بھی رگڑا میری قسمت میں؟ کرنل صاحب نے میرے خیالات کا تانا بانا توڑا،

''لیکن مجھے خدشہ ہے کہ قیدی لانے کے بجائے کہیں تم خود ہی دشمن کے اسیر نہ ہو جاؤ''۔

مجھے تمام افسران کے چہروں پر مسکراہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''تمہیں سترہ دسمبر کو لاہور جانا ہوگا دشمن کے قیدی کو گرفتار کرنے کے لئے'' کرنل صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

سب نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا، اور میں جھینپ کر رہ گیا۔ اچھا!!! تو یہ ڈراما

ہو رہا تھا میرے ساتھ؟

مجھے ایکسر سائز ایریا سے ہی پندرہ روز کی چھٹی مل گئی گو کہ میں نے سالانہ ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست دی تھی تاہم میرے لئے ان حالات میں یہ بھی بہت تھی۔ آٹھ دس دن پہلے اور بعد کے پانچ چھ روز کو میں نے بہت جانا۔ دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ رخسانہ کو پانے کا ایک اور مرحلہ طے ہو رہا تھا۔

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا ''رُخسانہ میں آ رہا ہوں''

☆ ☆ ☆

دو دل ایک ہوئے

چھٹی ملنے پر گھر پہنچا تو ہر طرف رونقیں اور ہلہ گلہ نظر آیا۔ کارڈ تقریباً بانٹے جا چکے تھے۔ امی اور اکلوتی بہن حمیرا بازاروں کے چکر پہ چکر لگا رہی تھیں۔ اپنے جن دوستوں کو دعوت دینی تھی انہیں بھی دعوت نامے پہنچائے بس ایک دوست رہ گیا جو سب سے اہم اور عزیز از جان دوست تھا اور جس نے رخسانہ کو پانے کیلئے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا تھا۔ جی ہاں ظفر خالد۔ دراصل ظفر کا تعلق کشمیر کے علاقے باغ سے تھا۔ وہ صرف تعلیم کے حصول لئے راولپنڈی میں اپنے والد کے ایک دوست کے ہاں مقیم تھا۔ گاؤں صرف موسم گرما اور سرما کی چھٹیوں میں جانا ہوتا تھا۔ عجیب اتفاق تھا کہ ظفر کو ان دنوں گاؤں جانا تھا اور اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میری شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔ بہر حال مجھے اس کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ بالکل ایسے جیسے اپنے کسی بھائی کی غیر حاضری کو محسوس کیا جاتا ہے۔ اسکی کمی میں آج بھی محسوس کرتا ہوں کیونکہ چند ماہ قبل اسکے بیٹے ارباب خالد نے مجھے فیس بک پر ڈھونڈھ نکالا اور جب میں نے اسے ظفر سے بات کرانے کو کہا تو اس نے بتایا کہ ابو ایک سال پہلے دنیا سے منہ موڑ چکے ہیں۔ زیادہ دکھ اسوقت ہوا جب اس نے انکشاف کیا کہ وہ مجھے ظفر کے کہنے پر بہت پہلے فیس بک پر ڈھونڈھ چکا تھا اور ظفر باقاعدہ میری فیس بک دیکھا کرتا تھا لیکن اس نے بیٹے کو منع کر رکھا تھا کہ مجھے اسکی علالت کے بارے بالکل نہ بتائے۔ آج اگر میں اس کتاب میں اسکا تذکرہ کر رہا

ہوں تو یہ اسکا حق ہے جو شاید میں پوری طرح ادا نہیں کر پا رہا۔

بات شادی کی تیاریوں کی ہو رہی تھی جو عروج پر تھیں اور جو اباجی کی سفید پوشی کو مدنظر رکھ کر کی جا رہی تھیں۔ میں نے بارات والے دن کے لئے سرمئی شیروانی سلنے کے لئے دے رکھی تھی جبکہ ولیمے کے لئے سیاہ انگلش سوٹ سلوا رکھا تھا۔ ایک خوبصورت رواج ہوا کرتا تھا کہ بارات کی روانگی سے قبل یا ایک روز پہلے سہرا بندی ہوا کرتی تھی، اور منظوم سہرا پڑھا جاتا تھا۔ دولہے میاں کو باقاعدہ گوٹے کناری والا سہرا باندھنا پڑتا تھا اور اس سہرے اور دولہے کا ساتھ بارات کی واپسی تک رہتا تھا۔ پڑھا جانے والا سہرا، کسی دوست یا جاننے والے بزرگ سے بھی لکھوالیا جاتا تھا۔ جان پہچان والوں میں کسی شاعر کا ہونا سونے پہ سُہاگہ کے مترادف ہوتا تھا اور یہاں والد مرحوم الطاف پرواز خود نامی گرامی شاعر اور قتیل شفائی، ندیم قاسمی، حسن بخت اور شہزاد احمد کے ہم عصر تھے۔ سو سہرا اُنہوں نے خود لکھا۔ سہرا بندی کے لئے ۱۶ ردسمبر ۱۹۷۵ء کی شام چنی گئی کیونکہ بارات کو اگلے روز علی الصبح لاہور کے لئے روانہ ہونا تھا۔ چونکہ گھریلو معاملات میں امی جی کی حیثیت سالار جنگ کی سی ہوتی تھی، سو شادی کے انتظامی معاملات میں بھی ان کے فیصلے حرف آخر تھے۔ عین سہرا بندی کے موقع پر حکم نادر شاہی آیا کہ اپنی شیروانی پہنو۔ میں نے بصد احترام عرض کیا کہ شیروانی تو بارات کے لئے سلوائی گئی ہے۔ جواب ملا ساری عمر اپنی مرضی کرتے رہنا اسوقت جو میں کہتی ہوں وہ کرو۔ بارات پر کالا سوٹ پہن لینا! یا اللہ یہ کیا ہو گیا؟ سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ گئے۔

آخری حربہ استعمال کیا،

''مگر امی ولیمے والے دن کیا پہنوں گا''؟

''کچھ بھی پہن لینا۔ کپڑوں کا کال ہے کیا؟''

جواب ملا۔

ہمارے زمانے میں والدین کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ آجکل تو بچے لباس تو دور کی بات مہندی، اسٹیج، ولیمہ سب کچھ خود طے کر کے ماں باپ کو صرف اطلاع دیتے

ہیں۔ خصوصاً لڑکے تو کرتے ہی اپنی من مانی ہیں۔ بہر حال میرے پاس حکم ماننے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا۔ بوجھل دل سے شیروانی استری کی اور سہرابندی کے موقع پر پہن لی۔ لاہور سے تمام خالائیں، ان کے بچے اور دیگر عزیز بھی موجود تھے۔ ذہن پر ایک بوجھ ضرور تھا اور سہرابندی کی تصاویر میں وہ میرے چہرے پر دیکھا جا سکتا تھا لیکن والدین کی نافرمانی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ سہرا باندھا گیا، ابا جی نے دعا کرائی، مٹھائی تقسیم ہوئی اور پھر ابا جی نے اپنی کھنک دار آواز میں سہرا پڑھا۔ تقریب ختم ہوئی تو مجھے بے صبری سے صبح کا انتظار ہونے لگا۔ دولہے کی کار کے طور پر میرے دوست مبشر نے اپنی کار پیش کر دی جبکہ دیگر مہمانوں کے لئے ایک بس بک کرائی گئی۔

سن ۱۹۷۵ء تھا اور ماہ دسمبر کی ۱۷ تاریخ تھی، دن بدھوار تھا اور یقیناً یہ میری زندگی کا ایک ناقابل فراموش دن تھا۔ راولپنڈی ویسے ہی جاڑوں کی سردی کے لئے بدنام تھا لیکن یہ دن کچھ زیادہ ہی سرد تھا۔ وہ الگ بات ہے کہ میں خوشی میں سردی تو کیا سب کچھ بھول چکا تھا۔ اللہ کا نام لیکر سات بجے صبح کے لگ بھگ یہ قافلہ لاہور کے لئے روانہ ہوا۔ پروگرام تھا کہ میں لاہور پہنچ کر لوہاری گیٹ سے کار کی سجاوٹ کراؤں گا جبکہ ابا جی بس کو لیکر سیدھے رائٹرز گلڈ کے دفتر پہنچیں گے جہاں میں ان سے جا ملوں گا۔ اور وہاں سے بارات کی صورت میں لاہور کے دیگر مہمانوں کے ہمراہ ہم اسلامیہ پارک کے لئے روانہ ہونگے۔ میرے سینئر دوست سلیم لالی جو اس وقت کیپٹن تھے اور لاہور میں تعینات تھے انہوں نے فوجی بینڈ کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ تمام کام بخیر وخوبی الحمدللہ وقت اور پروگرام کے مطابق انجام پائے اور تقریباً سوا بارہ بجے دوپہر ہم اسلامیہ پارک کے لئے روانہ ہوئے۔ ماموں جی کے گھر سے چند سو گز کے فاصلے پر کیپٹن لالی اور لیفٹیننٹ فیاض نے پنجاب رجمنٹ کے بینڈ کے ہمراہ ہروال دستے کی پوزیشن سنبھالی ہوئی تھی اور یوں خوبصورت دھنوں کے ساتھ ہم دلہن کے گھر کی جانب روانہ ہوئے (شکر ہے کہ اس وقت کسی کو اے مرد مجاہد جاگ ذرا کی دھن بجانے کا خیال نہیں آیا)۔ جوں جوں گھر نزدیک آتا جا رہا تھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دل کو ابھی بھی یقین

نہیں آ رہا تھا کہ آج رخسانہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری ہو جائے گی۔

دروازے پر ماموں ریاض، دیگر بزرگوں اور میرے برادر نسبتی فاروق ریاض نے استقبال کیا اور گلے میں ہار ڈالے۔ ننھی راحیلہ اور فرزانہ بھی تھوڑی دیر کے لئے سامنے آئیں اور استقبال کر کے چلی گئیں۔ نکاح ہوا اندر گھر میں لے جایا گیا۔ جہاں دیگر رسومات ادا کی گئیں۔ اور تقریباً ساڑھے چار بجے واپسی کا قصد کیا گیا۔ جاتے ہوئے تو کار میں مبشر میں اور میرے بڑے بھائی جان مشتاق علوی مرحوم تھے۔ لیکن واپسی پر میری خواہش تھی کہ ہمارے ساتھ دردانہ اور میری ہمشیرہ حمیرا ضرور ہوں۔ رخصتی کا وقت قریب آیا اور میں رخسانہ کے ساتھ کار کی جانب بڑھا تو ایک دھچکا لگا اور پنجابی کا وہ محاورہ بے ساختہ ذہن میں گھوم گیا، ''چور نالوں پنڈھ کاہلی'' (چور سے زیادہ چوری کے مال کی گٹھڑی بے تاب)۔ میری دو عدد کزن بیبیاں ہم سے پہلے گاڑی میں براجمان ہمیں والہانہ انداز میں اشارے کر رہی تھیں کہ آجاؤ، آجاؤ جلدی کرو۔ گھر کی دہلیز پر کھڑے میں نے امی کی طرف دیکھا جو معاملے کی نزاکت بھانپ گئیں۔ میرے کان میں سرگوشی کی کہ کوئی بات نہیں حمیرا ہمارے ساتھ بس میں چلی جائیگی۔ ایک کزن کو تو تقریباً گھسیٹ کر گاڑی سے اُتارا، تاہم دوسری ذرا ثابت قدم ثابت ہوئی، سوٹس سے مس نہ ہوئی لہٰذا صرف دردانہ کے لئے ہی جگہ بن پائی۔ مغرب کا وقت تھا جب بارات نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔

ایک طرف اگر مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ رخسانہ بالآخر میرا جیون ساتھی بن کر میرے ساتھ جا رہی تھی تو دوسری طرف مجھے افسردگی نے بھی گھیرا ہوا تھا کہ رخسانہ بابل کا دیس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر ایک نئے سفر کے لئے روانہ ہو رہی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی قربانی ہے جو ہر لڑکی دیتی ہے اور وہ ہی اس کے درد کو محسوس کر سکتی ہے۔ مرد بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اس بات کا احساس کرتے ہیں۔ وہ گھر جس کے در و دیوار سے لڑکی مانوس ہوتی ہے، جہاں باپ کے لئے وہ شہزادی کا درجہ رکھتی ہے، بھائی اس کے لئے جان ہتھیلی پر رکھے پھرتے ہیں۔ بہنیں اس کا دکھ سکھ سننے کے لئے ہمہ وقت موجود ہوتی ہیں اور ماں جسے دیکھ دیکھ کر جیتی ہے

آناً فاناً اس کے لئے اجنبی اور بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات مجھے شادی کے بہت دیر بعد رخسانہ نے بتائی کہ جب شادی کے بعد ہم پہلی دفعہ لاہور گئے تو اچانک اُسے یوں لگا جیسے اس گھر کے در و بام اس کے لئے اجنبی ہیں گو کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ایسا کیوں لگا؟

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ہم واپس پنڈی پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد باقی لوگ بھی پہنچ گئے اور باقی رات کا زیادہ حصہ سب کے ساتھ بیٹھ کر دھما چوکڑی میں گزارا۔ بزرگ کہیں کہ انہیں اپنے کمرے میں جانے دو آرام کرنے دو مگر خالہ زاد، ماموں زاد اور بہن بھائی بھلا کس کی سنتے تھے۔ تھکن سے ہم دونوں چُور لیکن ڈرتے ہوئے کسی سے کچھ کہیں بھی ناں ـــــــ

بہر حال یہ دن اور رات ہمارے لئے تاریخی تھا کہ اللہ نے بالآخر ہمیں ایک دوسرے کا جیون ساتھی بنا ہی دیا۔ ایک دن کے وقفہ کے بعد ۱۹/ دسمبر بروز جمعہ کو ولیمے کا عشائیہ تھا۔ میں نے ولیمے کیلئے خوبصورت سرخ کوٹ، سیاہ پتلون اور سفید قمیص کے ساتھ سیاہ بو کا انتخاب کیا اور عجیب اتفاق کے نئے سلے سوٹ اور شروانی کے مقابلے میں یہ پرانا لباس زیادہ پسند کیا گیا۔ خیر یہ دن بھی چلا گیا اور مہمان بھی اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے۔ مجھے سکون ہوا تو بخار نے آن گھیرا کہ چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔ کل چار چھٹیاں رہ گئی تھیں اور ہمیں لاہور کا چکر بھی لگانا تھا۔ امی سے بات کی تو دو دن کی اجازت ملی جسے کھینچ تان کر تین دن کا کیا۔ زندگی کے ایک حسین سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔ رخسانہ کو اپنا ہم قدم پا کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ایک عجیب سے فخر کا احساس ہوتا تھا۔ سسرال میں سب نے بیحد آؤ بھگت کی اور بے پناہ پیار دیا۔ پلک جھپکنے میں تین روز گزر گئے اور ہم واپس پنڈی آ گئے۔ اگلے روز مجھے اپنی ڈیوٹی پر واپس جانا تھا ہم ساری رات باتیں کرتے رہے مستقبل کے منصوبوں کے خاکوں میں رنگ بھرتے رہے۔

رخسانہ میرے جانے کے بعد ہونے والی اپنی اُداسی کا اظہار کرتی رہی اور میں اُسے تسلیاں دیتا رہا کہ ان شاٗاللہ ہم جلد ایک ساتھ ہونگے۔ ان تحفظات اور تسلیوں کی بھی اپنی ہی خوبصورتی اور چاشنی ہوتی ہے۔ کسی بھی عورت کو جب یہ یقین ہو جائے کہ اس کے جیون ساتھی

کے بازوؤں کا مضبوط حصار اسے دُنیا کی تمام سختیوں، آزمائشوں اور گرمی سردی سے محفوظ رکھ سکتا ہے تو اس کے فخر و اعتماد کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ میں ٹھہرا ایک نوجوان جوشیلا لیفٹینن جو ابھی خود بھی زمانے کی چالبازیوں سے آگاہ نہ تھا لیکن مجھے رخسانہ کی آنکھوں میں تیقن اور خود اعتمادی کی چمک نظر آرہی تھی۔ اگلے روز رخسانہ کو اداس چھوڑ کر میں اپنی پلٹن کے لئے روانہ ہو گیا۔ تمام راستے اس کا معصوم اور اُداس چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رہا۔ لیکن ایک اطمینان تھا کہ عنقریب یونٹ کا سرحدوں پر تعیناتی کا عرصہ ختم ہونے والا تھا اور پلٹن کو چھ ماہ کے لئے منگلا چھاؤنی آنا تھا جس کی شہرت بہت سُن رکھی تھی لیکن دیکھی نہیں تھی۔

پاک فوج کی اپنی بہت سی خوبصورت روائتیں ہیں شادی ہو، بچے کی ولادت ہو، پروموشن ہو غرضیکہ ہر خوشی کے موقع پر ساتھی اور آپ کی کمپنی کے ماتحت آپ کی جیب پر دھاوا بولنے سے نہیں چوکتے۔ شیرینی اور کھانوں کے علاوہ ایک روایت ہے چٹ لکھنے کی، آپ کی کمپنی والے انتظام و انصرام والی پلاٹونیں، میس حوالدار، خانساماں، خاکروب ہر کوئی پہلے آپ کو سلوٹ پیش کریگا اور اس کے بعد وہ کاغذ قلم آپ کے سامنے کرے گا کہ مٹھائی کے لئے کوئی معقول سی رقم لکھ دی جائے۔ عموماً خوشی کے موقعوں پر آپ کی تنخواہ دعوتوں اور پرچیوں کی نذر ہو جایا کرتی ہے۔ میں اپنے ساتھ جتنے مٹھائی کے ڈبے اُٹھا سکتا تھا لیکر جا رہا تھا لیکن دیکھ رہا تھا کہ میس کی دعوتوں اور پرچیوں کی صورت میں میری آئندہ ماہ کی تنخواہ کا کیا حشر ہونے والا تھا۔ وہ تنخواہ آج تو شاید مذاق لگے لیکن اُس زمانے میں اس میں بہت برکت تھی ۱۹۷۲ء میں جب میں نے کمیشن حاصل کیا تو میری پہلی تنخواہ صرف پانچ سو روپے تھی۔ شادی کے وقت میری تنخواہ مبلغ پندرہ سو روپے کے لگ بھگ تھی لیکن میں اس تنخواہ کے ساتھ کسی بھی لکھ پتی سے کم نہ تھا۔ یونٹ پہنچا تو ہر ایک سے فرداً فرداً مبارک باد وصول کی، مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔ بارڈر کے منفرد انداز کے تعمیر کردہ زیرزمین میس میں دعوت دی اور زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی۔ یونٹ نے جنوری ۱۹۷۶ء کے تیسرے ہفتے میں منگلا جانا تھا۔ اور میں نے دن گننے شروع کر دئے۔

☆ ☆ ☆

613-فورتھ ایونیو

ہماری رجمنٹ بارڈر ڈیوٹی کے بعد اپنے کیمپ ایریا میں پہنچ چکی تھی۔ سینئر افسران کو برال کالونی، منگلا میں رہائش کی سہولت دستیاب تھی اور انکے گھر وہاں پہلے ہی سے موجود تھے جبکہ غیر شادی شدہ افسران کا پڑاؤ BOQs (بیچلر آفیسرز کوارٹرز) میں ہوا کرتا تھا۔ مجھے چونکہ ابھی تک گھر نہیں ملا تھا سو میرا شمار مجبوراً اس دوسری صنف میں ہی ہوا۔ ایک سینئر آفیسر ایسے تھے جن کا نکاح تو ہو چکا تھا لیکن فی الحال بیگم کی آمد نہیں ہوئی تھی اور محض نکاح کی بنیاد پر انھوں نے گھر لے رکھا تھا۔ میرا اُن سے محلے داری کا پرانا تعلق تھا اور ہم سٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی میں پڑوسی رہ چکے تھے چنانچہ میں نے ان سے درخواست کی جب تک مجھے گھر نہیں ملتا وہ اپنا گھر مجھے عاریتاً دے دیں۔ اس عرصے کا کرایہ میں سرکاری خزانے میں جمع کرا دیا کروں گا۔ انہوں نے میری درخواست بخوشی قبول کر لی تا ہم دوسری جانب اپنے گھر کے لئے بھی میں نے کوششیں بھر پور طریقے سے جاری رکھیں اور مجھے اس سلسلے میں ایک ایسا نسخہ ہاتھ لگا کہ اسٹیشن ہیڈکوارٹرز والوں کو مجھے گھر دیتے ہی بنی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ہمارا گھر ہوگا جہاں بس ہم دونوں ہونگے۔ میں رُخسانہ کو منگلا لا چُکا تھا اور اپنے یونٹ آفیسر سے مستعار لئے گھر میں رخسانہ کے ساتھ مقیم تھا۔ امی ایک وضع دار خاتون ہونے کے ناطے بہت سی باتوں کا خیال رکھا کرتی تھیں سو کچھ بنیادی باتیں سمجھانے کیلئے جو کسی بھی نو بیاہتا دوشیزہ کیلئے ضروری ہوتی ہیں،

وہ چند دنوں کیلئے ساتھ آئیں۔

منگلا میری سوچ سے زیادہ رومان پرور اور پُر سکون چھاؤنی تھی۔ جو قارئین منگلا دیکھ چکے یا رہ چکے ہیں اور جو خواتین والد، بھائی یا شوہر کے حوالے سے منگلا کی رہائش سے مستفیض ہو چکی ہیں وہ یقیناً میری اس بات کی تائید کریں گی۔ یہ منگلا ڈیم بنانے والی ایک امریکی کمپنی کی کالونی تھی۔ جو کمپنی، پروجیکٹ کی تکمیل کے بعد حکومت پاکستان کے حوالے کر گئی اور یوں یہ پاک آرمی کے حصے میں آ کر خوبصورت فوجی چھاؤنی میں تبدیل ہو گئی۔ اس کا ایک حصہ واپڈا کے ملازمین کے لئے مختص کر دیا گیا۔ کالونی کی اپنی ایک خوبصورت مارکیٹ، سینما، بار اور مسجد ہے۔ میں نہیں جانتا بہرال کالونی اب کس حال میں ہے۔

بہر حال، بات اُس گھر کی ہو رہی تھی جو ایک صبح کو بالآخر مجھے الاٹ ہو ہی گیا۔ مجھے فوج کی ملازمت کے دوران مختلف اسٹیشنوں پر بیحد خوبصورت گھر ملے جن کا آگے چل کر کسی نہ کسی حوالے سے ذکر آئیگا لیکن منگلا کا یہ گھر شاید میں کبھی ناں بھلا سکوں۔ یہ وہ گھر تھا جہاں دو سچا پیار کرنے والوں نے ان گنت چاہتوں اور بے پناہ پیار کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ میں اکثر یہ کہتا ہوں کہ میں بوجوہ ہنی مون تو کہیں نہیں جا سکا لیکن منگلا کے ماحول اور اس خوبصورت ننھے سے سنگل بیڈ روم گھر نے ماحول، گردونواح کے نظاروں اور سہولیات کے حوالے سے مجھے ہنی مون کے وہ تمام لوازمات مہیا کئے جن کے لئے انسان کو اچھی خاصی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔ اسی لئے میں اور گھروں کا تذکرہ تو شاید تفصیلات میں جائے بغیر کروں لیکن میری خواہش ہے کہ یہ گھر امر رہے اور اسی لئے اس کتاب میں، میں اس کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ مجھے یہ ترغیب میرے دو نہایت پسندیدہ مصنفوں چارلس ڈکنز اور والدِ مرحوم کے قریبی دوست قدرت اللہ شہاب مرحوم کی تحریروں سے ملی۔ چارلس ڈکنز نے تو اپنے ناول کا نام ہی پورٹس ماؤتھ لندن میں واقع مشہور زمانہ دکان، ''اولڈ کریاسٹی شاپ'' (Old Curiosity Shop) کے نام پر رکھا، جسے دیکھنے کیلئے دنیا بھر سے سیاح آج بھی

لندن آتے ہیں، جبکہ شہابؔ صاحب نے اپنی پر سرار رہائشگاہ، 18 رسول لائنز راولپنڈی کا ذکر شہاب نامہ میں کیا ہے۔ مجھے فورتھ ایونیو میں واقع گھر نمبر 613 الاٹ کیا گیا اور اس گھر نمبر 613 نے مجھے جو خوشیاں دی ان کے بدلے میں یقیناً اس کا اتنا حق بنتا ہے۔

ایک اچھی بات یہ تھی کہ سامنے والے گھر میں ہمارے کمانڈنگ آفیسر کرنل سید امتیاز حسین بخاری کی رہائش تھی اور یہ بات میرے اور امی جان کے لئے بے حد اطمینان کا باعث تھی۔ اس گھر میں منتقل ہونے پر ہمارا سب سے پہلا کھانا بھی ہمارے سی او نے ہی کیا۔ اللہ سلامت رکھے، فریدہ آپا ایک نہایت ہنس مکھ، ملنسار اور مہمان نواز خاتون ہیں۔ میں صبح دفتر جاتا تو پورا دن کام کیساتھ ساتھ واپسی کا انتظار رہوتا۔ ایک خوبصورت احساس ذہن میں جاگزیں رہتا کہ گھر پر کسی کو میرا انتظار ہے اور یہ ایک بے حد منفرد اور خوبصورت احساس تھا۔ دوپہر کو گھر آتا تو ہر روز کوئی نہ کوئی نئی چیز پکی ہوتی۔ امی، رخسانہ اور میں دوپہر کا کھانا اکٹھے کھاتے خوش گپیاں ہوتیں۔ تین چار روز بعد امی نے اپنی واپسی کا اعلان کر دیا ہمارے اصرار کے باوجود ان کا کہنا تھا کہ ''مجھے اپنا گھر بھی دیکھنا ہے تم لوگ اپنا گھر دیکھو''۔ امی چلی گئیں اور اب میں اور رخسانہ! بس ہم دو؟ ایک عجیب سا احساس، خوبصورت سی آزادی اور نہایت پیارا ساتھ تھا۔ امی کی روانگی کے اگلے ہی روز ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر ہم اپنے ملنے جلنے والوں سے اکثر کیا کرتے تھے۔

میں دفتر سے واپس آیا تو رُخسانہ نے اسی طرح پرتپاک انداز اور دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ جب میں نے کہا،

''چلو بھئی کھانا لاؤ بڑے زور کی بھوک لگی ہے''۔

تو جواب ملا،

''کھانا تو نہیں بنا!''۔

''کھانا نہیں پکا؟ کیوں؟''

میں نے حیران ہو کر قدرے اُونچی آواز میں پوچھا۔

''سہیل! مجھے پکانا نہیں آتا ناں''۔

رُخسانہ نے نہایت معصومیت سے تقریباً روہانسی آواز میں سچ بول دیا۔

اس کی معصومیت دیکھ کر میرے آتے آتے غصے کی جھلک یک لخت قہقہے میں بدل گئی،

''اور یہ جو چار روز سے مزے مزے کے پکوان تیار ہو رہے تھے''؟

''وہ تو امی جان بناتی تھیں''۔

اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر اگلا سچ بول دیا۔

میں نے بے اختیار اپنے معصوم جیون ساتھی کو سینے سے لگالیا۔ اب اردلی کی باری تھی جس کے فرائض منصبی میں یہ کام شامل ہی نہیں تھے، بس منت سماجت والی بات تھی۔ اسے بلا کر پوچھا تو موصوف نے صاف انکار کر دیا کہ اُسے تو کچھ پکانا آتا ہی نہیں۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا؟ میں نے دل ہی دل میں سوچا پھر رُخسانہ سے پوچھا،

''تمہیں کسی نے بتایا نہیں تھا کہ پیا کے گھر سدھارنے سے قبل تھوڑی بہت ہانڈی روٹی سیکھ لی جاتی ہے''؟

''امی نے بہت کہا تھا کہ تھوڑی بہت ہانڈی روٹی کرنی سیکھ لو لیکن میں نے کہا کہ مجھے کیا ضرورت ہے، ہم میس سے کھانا منگوالیا کریں گے۔''

یہ سادہ لوحی کی انتہا تھی۔ خیر میں کمرے میں گیا اور وردی تبدیل کر کے واپس آیا۔ رخسانہ اور اردلی دونوں کو لیکر کچن میں پہنچا۔ پتہ چلا کہ گھر میں مٹر اور قیمہ موجود ہے اردلی کو مٹر چھیلنے کو دیئے اور دونوں سے کہا کہ آج دوپہر کا کھانا میں پہلی اور آخری بار بنا رہا ہوں غور سے دیکھ لو۔ اس کے بعد یہ مشقت تم دونوں کی ہے۔ کچا پکا جو بھی بناؤ گے ضرور کھاؤں گا لیکن بناؤ گے تم دونوں۔

بچپن میں امی کا ہاتھ بٹانے کے سبب امور خانہ داری کے کئی شعبوں میں خاصی شد بد

حاصل تھی۔سب سے پہلے ان کے سامنے آٹا گوندھا اس کے بعد ہانڈی چڑھائی۔ ہر مرحلے میں رخسانہ کو کوکنگ کے بنیادی اُصول از بر کراتا رہا اور تھوڑی دیر میں باداموں والا مٹر قیمہ تیار تھا۔اب اس خاکسار نے چولہے پر توّا اوندھا کیا اور روٹیاں بنائیں اور ساتھ ساتھ اردلی پر احسان جتلایا،

''ریاض! تمھیں فوج میں ایسا افسر نہیں ملے گا جو اپنے اردلی کی خدمت کرے اور اسے خود کھانا پکا کر کھلائے''۔

جواباً ریاض پوری بتیسی نکال کر ڈیڑھ من کا سر زور زور سے ہلاتا رہا۔رخسانہ میری کوکنگ سے بہت متاثر ہوئی۔ کہنے لگی،

''ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ روز آفس سے آکر کھانا بنالیا کریں، یا رات کو ہی سالن پکالیں''؟

آپ ہی بتائیں کہ میں اس سادگی پر مرتا ناں تو کیا کرتا؟ بہت ہی محبت اور پیار سے وارننگ دی،

''بلّی! میں نے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ بس آج پکایا سو پکایا۔اب کل سے یہ تمھاری ذمہ داری ہے''۔

رخسانہ کو گھر میں پیار سے بلّی کہتے تھے۔اور حسن اتفاق کہ میرا بچپن کا نام بلّا تھا۔سو میں کبھی بلّی کبھی چھاناں اور کبھی سندری کہہ کر بُلایا کرتا تھا اور ان تینوں ناموں کے لئے مواقع مختلف ہوا کرتے تھے۔خاندان والے اور دوست احباب اکثر پیار اور مذاق سے ہمیں بلّے بلّی کی جوڑی اور بچوں کی پیدائش کے بعد بلیوں کا کنبہ کہا کرتے تھے۔

اگلے روز دفتر سے آیا تو آلو گوشت بنا ہوا تھا اور بہت اچھا بنا تھا۔رخسانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا کہ کیا اس نے خود بنایا تھا تو جواب آیا کہ اُسی نے بنایا تھا بس فریدہ بھابھی نے تھوڑی مدد کی تھی۔چپاتیوں کے بارے میں انکشاف ہوا کہ کرنل صاحب کے اردلی

نے معاونت کی تھی۔ دفتر میں کرنل صاحب سے معذرت کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے نہایت مشفقانہ انداز میں سمجھا دیا کہ،'' برخوردار! خواتین ہمارے دفتری معاملات کا حصہ نہیں، اُنکی اپنی دنیا ہے اور انہیں سینئر جونیئر کے چکر میں مت الجھانا۔ کرنے دو انہیں جو وہ کرتی ہیں''۔ اور میں جیسے سب سمجھ گیا۔ حوصلہ افزأ بات یہ تھی کہ رخسانہ بھی رسوئی کے معاملات بہت جلد سمجھ گئی جو کہ خاصا حیران کن امر تھا۔ دنوں میں وہ نہایت مہارت سے کھانا پکانے لگی اور صرف ایک ماہ کے اندر ہم نے یونٹ کے افسران اور چند دیگر ملنے جلنے والوں کا عشائیہ کر ڈالا جس کی سب نے بے حد تعریف بھی کی۔ اہم بات یہ تھی کہ رخسانہ نے اس عشائیے کی تیاری تن تنہا صرف اردلی کی معاونت سے کی۔ جلد ہی کالونی میں رخسانہ کی کوکنگ کے چرچے ہونے لگے۔ ہم دونوں کے گھروں تک جب اس دعوت کی خبر پہنچی تو کسی نے بھی یقین نہ کیا۔

رفتہ رفتہ ہم نے منگلا کالونی کی منفرد زندگی سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔ برال کالونی کے ہر ایونیو کی سڑک سرسبز درختوں سے ڈھکی حسین خاموشی لئے ہوئے ہے اور انکے نشیب و فراز کسی پہاڑی مقام کا منظر پیش کرتے ہیں جو بارشوں کے موسموں میں حس لطیف رکھنے والے شخص پر ایک سحر طاری کر دیتے ہیں۔ مجھے علم نہیں، اب وہاں رہنے والے کسطرح لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ منگلا میں بارش ہو اور ہم دو پریم پنچھی (Love Birds) رین کوٹ (برساتیاں) پہن کر بھیگے موسم کا مزا لینے باہر نہ نکلیں۔ ایسی ہی بوندا باندی کی ایک سرد شام کو ہم مارکیٹ کیلئے نکلے تو رم جھم جاری تھی۔ رخسانہ کے پاس اتفاق سے کوٹ نہ تھا سو میں نے اپنا کوٹ اسے اوڑھا دیا۔ ہم چند ہی قدم چلے ہونگے کہ ملٹری پولیس کی جیپ آ کر رکی اور ایک بچی نے اتر کر اپنی شال رخسانہ کو دے دی اور کہا،'' آنٹی انکل کا کوٹ انہیں واپس کر دیں وہ بھیگ رہے ہیں آپ یہ شال لے لیں''۔ باتوں باتوں میں علم ہوا کہ وہ ملٹری پولیس کے کمانڈنگ آفیسر کرنل امیر عالم کی صاحبزادی تھی۔ اس شال کے حوالے سے ان لوگوں سے نہایت قریبی تعلقات استوار ہوئے اور تب مجھے علم ہوا کہ انکے بچوں نے میرا نام

''انکل چادر والے'' رکھ چھوڑا تھا۔ سردیوں کی شاموں میں بلا ناغہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مارکیٹ چلے جاتے جہاں زیادہ تر ''ونڈو شاپنگ'' ہوتی۔ ویک انڈ پر دونوں دن سینما میں فلم ضرور دیکھی جاتی کیوں کہ ایک روز اُردو اور ایک روز انگلش فلم ہوا کرتی تھی۔ تمبولا بھی کھیلا جاتا۔ دل میں ایک خواہش اُٹھتی کہ کاش یہ چھ ماہ، چھ سال میں تبدیل ہو جائیں۔

۲۳ر مارچ ۱۹۷۶ء یوم پاکستان نزدیک آرہا تھا۔ اس موقع پر دیگر بڑی چھاؤنیوں کیطرح جہلم میں بھی پریڈ ہوا کرتی تھی اور رات کو فارمیشن میس میں ڈنر۔ اس موقع پر فارمیشن کی ہر یونٹ سے کمانڈنگ آفیسر بمعہ ایک آفیسر اور اپنی بیگمات کے شریک ہوا کرتے تھے۔ ہمارے سی او نے تو جانا ہی جانا تھا۔ دوسرے آفیسر کے لئے انہوں نے مجھے چن لیا۔ رخسانہ کے ہمراہ یہ میرا کوئی پہلا سرکاری عشائیہ تھا چنانچہ میں اسے آرمی ڈنر کے ادب آداب سمجھانے لگ گیا۔ گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ خوشی بھی تھی۔ ۲۳ر مارچ کی شام کو ڈنر کے موقع پر میں نے مخصوص سفید ڈنر میس کٹ پہنی جبکہ رُخسانہ کو میں نے سفید ساڑھی باندھنے کو کہا۔ سفید اسلئے کہ ہم دونوں منفرد نظر آئیں۔ رُخسانہ کو ساڑھیوں کا شوق بھی بہت تھا اور وہ carry (سنبھالتی) بھی اچھا کیا کرتی تھی۔ اس زمانے میں ساڑھیاں زیادہ تر سینئر افسران کی بیگمات ہی پہنا کرتی تھیں، سو تقریب میں سینئر افسران کی بیگمات کو جب ایک نوجوان دوشیزہ ساڑھی میں نظر آئی تو اُنھیں تجسس ہوا۔ بہت سی اُسے بُلا کر ملیں اور میں رخسانہ کی خود اعتمادی دیکھ کر دور ہی دور سے "جل تو جلال تو" پڑھتا رہا۔ تقریب کے اختتام پر جب ہم منگلا لوٹے تو راستے میں رخسانہ نے بتایا کہ ایک دو بریگیڈیئر صاحبان کی بیگمات اور جنرل صاحب کی بیگم میری دوست بن گئیں ہیں۔ میں نے ایک جھرجھری لی اور بے ساختہ بول اُٹھا،

''او بی بی! خدا کے واسطے مجھے نوکری کرنے دینا۔ یہ ہاتھیوں کے مالکان سے دوستی مت لگانا۔ میں ٹھہرا ایک غریب لفٹین''۔ خیر اس وقت تو نہیں لیکن بہت بعد میں رخسانہ کو یہ فلسفہ بخوبی سمجھ آ گیا۔ دراصل کوئی بھی حقیقت سمجھنے کے لئے واسطہ پڑنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔

ہماری شادی کے یہ ابتدائی دن بے حد خوبصورت اور یادگار تھے اور ہوتے بھی کیسے ناں؟ جاڑا پھر بہار، منگلا کالونی جیسی خوبصورت رومان پرور جگہ اور بے فکری کے دن۔ رخسانہ کی ایک پرانی عادت تھی کہ ہمہ وقت ٹرانسسٹر ریڈیو اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ گھر میں گھومتے پھرتے، کام کاج کرتے ٹرانسسٹر ہر وقت کان سے لگا ہوتا۔ شادی سے پہلے وہ اپنی اس عادت کی بدولت اپنے والد سے بارہا ڈانٹ کھا چکی تھی لیکن یہ مشغلہ شادی کے بعد بھی جاری رہا۔ شادی کے شروع کے دنوں میں اکثر ایک گانا اسکے ٹرانسسٹر پر گونجتا،''دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن''۔ میں جب بھی یہ گانا سنتا مجھے بہت بھلا محسوس ہوتا۔ بعد کی زندگی میں اس گانے سے میری منگلا اور شادی کے ابتدائی ایام کی یادیں وابستہ ہو گئیں۔ گیت سنگیت کا شوق تو مجھے بھی تھا لیکن اس قدر نہیں لیکن سچ پوچھیں تو رخسانہ کو ایسا کرتا دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ شادی کے بعد مجھے بھی اپنی ایک اچھی یا بری عادت کا علم ہوا اور وہ بھی اس وقت جب مجھے الصبح دفتر کے لئے تیار ہو کر نکلنا ہوتا، ایسے میں مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا کہ میں ناشتے کے لئے رخسانہ کو بیدار کروں۔ چنانچہ میں نے اردلی سے کہہ رکھا تھا کہ وہ صبح مجھے موسم کی مطابقت سے ایک گلاس گرم یا ٹھنڈا دودھ دے دیا کرے۔ اور یہ سہولت رخسانہ کو میری ریٹائرمنٹ تک میسر رہی۔ یہی وہ وقت تھا جب مجھے احساس ہوا کہ میں شادی سے پہلے بھی گھر میں کبھی کسی کے آرام میں مخل نہیں ہوا کرتا تھا۔ بہن بھائی سوئے ہوتے تو دبے پاؤں کمرے سے نکلتا۔ امی ابا جی آرام کر رہے ہوتے تو گھر میں کسی کو اُونچی آواز سے بات نہ کرنے دیتا۔ یہی معمول فوج میں آنے کے بعد میس میں رہائش کے دوران بھی رہا۔ لیکن عقدہ تب کھلا جب رخسانہ جیون ساتھی بنی۔

میں یونیفارم پہن کر تیار ہو کر دفتر کے لئے نکلنے لگتا تو رخسانہ کا پسندیدہ اسٹیشن ریڈیو سیلون ہلکی آواز میں لگا کر ٹرانسسٹر اس کے لحاف میں رکھ دیتا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے ایک پیاری مسکراہٹ کے ساتھ میرا شکریہ ادا کرتی اور مجھے خدا حافظ کہہ کر رخصت کرتی۔ میرے دو معمول فوج سے ریٹائرمنٹ تک تبدیل نہیں ہوئے۔ اول تو یہ کہ رخسانہ کو کبھی بھی ناشتے کے

لئے بیدار نہ کرنا اور دوسرا، ماسوائے چھٹی کے روز، دفتر جانے سے قبل ناشتے میں باقاعدگی سے دودھ کا گلاس لینا۔ اسی دوران رمضان آیا۔ ہمارے کرنل صاحب کا تبادلہ سٹاف کالج کوئٹہ ہو چکا تھا اور وہ گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ رمضان میں ایک روز اپنا سامان لینے آئے تو ہم سے علیک سلیک کے لئے دروازہ کھٹکھٹایا۔ رخسانہ کو معلوم ہوا کہ وہ روزے سے نہیں تو انکے منع کرتے کرتے ملک شیک بنالائی۔ کرنل صاحب نے دو گھونٹ بھر کر بیحد تعریف کی کہ شاید کسی خاص ترکیب سے بنایا گیا لگتا ہے۔ رخسانہ نے اصرار کر کے دوسرا گلاس بھی پلا دیا۔ ہم دونوں روزے سے تھے سو انکا ساتھ نہ دے سکے۔ افطاری کے بعد بچا کچھا ملک شیک پینے کا شرف حاصل ہوا تو معلوم پڑا کہ ملک شیک جگ میں پہلے کہیں ادرک لہسن بلینڈ ہو چکے تھے اور رخسانہ نے اسی میں ملک شیک بنا ڈالا تھا۔ کرنل صاحب تو جا چکے تھے لیکن ہم دونوں اس قدر شرمندگی کا شکار ہوئے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اب سمجھ آئی کہ بذلہ سنج کرنل صاحب کیوں تعریف کر رہے تھے۔ بعد میں کرنل امتیاز سے ملاقات ہوئی اور معذرت کی تو ہنستے ہوئے بولے،

''غلطی میری بھی تھی۔ نہ میں تعریف کرتا اور نہ مجھے دوسرا گلاس پینا پڑتا''۔

رخسانہ اکثر یہ واقعہ سب کو مزے لے لے کر سنایا کرتی تھی۔

مارچ کے آخری ایام تھے، دوپہر دفتر سے واپسی پر اسے خلاف توقع کچھ سست پایا۔ باتوں باتوں میں بریکنگ نیوز ملی کہ اب ہمیں اپنا سامان سکیڑنا ہوگا کیوں کہ ایک ننھے مہمان کی آمد تھی جسے ہماری حقیقی خوشیوں کی بنیادی وجہ بننا تھا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ دفتر سے فون کر کے امی کو اور لاہور ممانی جان کو اطلاع دی۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ اٹھی۔ امی بولیں کہ اسے ابھی چھوڑ کر جاؤ۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ حوصلہ کریں دو تین ماہ رہ گئے ہیں پھر میں بارڈر پر چلا جاؤں گا تو رخسانہ انہی کے پاس آئیگی۔ اب میں نے اس کا بے حد خیال رکھنا شروع کر دیا۔ یہ خوشخبری میری زندگی کا ایک اور سنگ میل تھی۔ دل میں خیال آتا کہ باپ بننے کی سوچ ہی سے اس قدر فخر محسوس ہوتا ہے تو باپ بن کر کیسا لگتا ہوگا؟ اٹھتے بیٹھتے ہم دونوں اجنبی مہمان

بارے سوچتے کہ کون ہوگا؟ ننھا فرشتہ یا ننھی پری؟ میری رفیقِ زندگی ننھے فرشتے کو آغوش میں بھرنا چاہتی تھی جبکہ میں ننھی پری کو سینے سے لگانا چاہتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ سے بیٹی ہی کی دعا مانگتا۔ ہم دونوں رات سونے سے پہلے بہت سے سپنے دیکھتے اور بے تحاشا منصوبے بناتے۔ دیکھتے دیکھتے وقت گزر گیا اور یونٹ کا دوبارہ سرحد پر جانے کا وقت آ گیا۔ ایک ویک اینڈ پر بوجھل دل کے ساتھ میں رخسانہ کو راولپنڈی چھوڑ آیا۔ امی، ابا جان اور بہن بھائیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ رخسانہ کو تاکید کی کہ مجھے باقاعدگی سے باخبر اور اپنا بیحد خیال رکھے۔

یونٹ کشمیر واپس پہنچی تو کچھ ہی عرصہ بعد ایک کورس کے لئے نام آ گیا۔ مجھے ایک ڈیڑھ ماہ کے لئے کوئٹہ جانا تھا۔ جن کا فوج سے کسی بھی طرح کا تعلق ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کوئی افسر کوئٹہ کورس کرنے جائے یا اس کا تبادلہ ہو اور وہ وہاں شاپنگ نہ کرے، یہ ممکن ہی نہیں۔ اور میں بھلا کس طرح پیچھے رہ سکتا تھا۔ دوران کورس وقت ملنے پر شاپنگ بھی کرتا تھا۔ سب گھر والوں کے لئے استعداد کے مطابق خریداری کی لیکن میری سب سے زیادہ خریداری اس ننھی روح کے لئے تھی جو عنقریب ہمیں اماں ابا بنانے جا رہی تھی۔ ہمیشہ سنتے آئے تھے اور دیکھا بھی تھا کہ بیٹیاں خوش بختی کی علامت ہوتی ہیں۔ کورس کے دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ باری تعالیٰ میرے آنگن میں یقیناً ننھی پری کو بھیج رہا ہے اور اس یقین کی بنیاد پر میں نے باقی شاپنگ لڑکیوں کے حوالے سے کی۔ ہوا یوں کہ ایک روز کورس کے دوران مجھے انفنٹری سکول کی انتظامیہ کی جانب سے بلاوا آیا۔ دیگر افسران کے بھی کان کھڑے ہو گئے کیونکہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہوتی تھی کہ کسی طالبعلم افسر کو بلاوہ آئے۔ ویسے بھی زیادہ تر یہ نیک شگون نہیں سمجھا جاتا اور پھر مجھ جیسے نہایت شرارتی اور غیر سنجیدہ افسر کے لئے سمن جاری ہونا تو اس بات پر دلیل تھی کہ کہیں نہ کہیں کوئی پھڈّا ہوا ضرور ہے۔ خیر کرنل صاحب کے دفتر میں حاضری دی سیلوٹ کیا اور ان کے میز کے سامنے ہوشیار پوزیشن میں کھڑا ہو گیا۔ قدرے توقف کے بعد انہوں نے آرام باش کا آرڈر دیا اور پوچھنے لگے کورس کیسا جا رہا ہے۔ میرے جواب

کے بعد بولے تمہاری شرارتوں کی خبریں تواتر سے مل رہی ہیں اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس کے بعد وہ خاموش ہوکر کھڑے ہو گئے اور میرا یہ حال کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ کوئی ایک شرارت ہوتی تو یاد ہوتا کہ پکڑ کس بات پر ہوئی ہے۔

کرنل صاحب نے بات دوبارہ شروع کی،

''اسلئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھیں کپتان کے عہدہ پر ترقی دی جائے۔ تمہاری پلٹن سے ترقی کا سگنل آیا ہے''۔

دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ انہوں نے میز سے ستاروں کی جوڑی اٹھائی اور اپنے معاون کی مدد سے مجھے کپتانی لگادی۔ میں نے سیلوٹ کیا اور واپس کلاس میں آیا جہاں سب سے مبارکباد لی۔ کلاس ختم ہوتے ہی سب کو گھر پر اطلاع دی۔ رخسانہ کو خاص طور پر فون پر بلوا کر بات کی اور کہا کہ یہ خوش بختی صرف بیٹی لاتی ہے سو تیار ہوجاو میری بیٹی کی ماں بننے کے لئے۔ ان دنوں تازہ تازہ اولمپک گیمز ہوئی تھیں جن میں رومانیہ کی جمناسٹ نادیہ کمانیچی کی بہت دھوم تھی۔ اسی سے متاثر ہوکر میں نے سوچ لیا کہ بیٹی ہوگی تو نام نادیہ ہی رکھوں گا۔

کورس ختم ہوا اور واپسی ہوئی تو گھر حاضری کے بعد یونٹ گیا۔ ننھے مہمان کی چیزیں دیکھ کر ہونے والی ماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ غالباً یہ نومبر کا مہینہ تھا اور ڈاکٹروں نے ہمیں ۲۰ ردسمبر کے بعد کا کوئی بھی وقت بتایا تھا۔ ۲۵ ردسمبر کو میں چھٹی پر گھر آ گیا۔ چھبیس دسمبر کو اسے سی ایم ایچ راولپنڈی میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ سوچ کر کہ اللہ کسی بھی وقت ہمارا آنگن خوشیوں سے بھر سکتا ہے، میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہورہی تھیں۔ امی رخسانہ کے ساتھ تھیں۔ اٹھائیس دسمبر ۱۹۷۶ء رات پونے نو بجے امی نے ہسپتال سے فون پر اطلاع دی کہ سہیل بیٹی ہوئی ہے مبارک ہو۔ پہلی دفعہ باپ بننے کے احساس اور رب العزت کے شکر سے میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو رواں تھے۔ مجھ سے رہا نہیں گیا اور بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچا۔ فیملی

وارڈ میں رخسانہ کونے والے بیڈ پر نڈھال لیکن چہرے پر معصوم مسکراہٹ اور عجیب ساغرور سمیٹے لیٹی تھی۔ پاس ہی جھولے میں وہ گول مٹول، سرخ وسفید ننھی منی گڑیا تھی جس کی آمد کا مجھے بے تابی سے انتظار تھا۔ میں نے سب سے پہلے رخسانہ کی خیریت دریافت کی اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ نازک سی گڑیا کو اُٹھاتے ہوئے مجھے بیحد ڈر لگا تاہم قل پڑھ کر اس پر پھونکے، گال پر بوسہ دیا اور باہر آکر بے اختیار ہچکیوں سے رو پڑا ـــــــــ یہ خوشی اور تشکر کے آنسو تھے۔
اگلے روز صبح اباجی بھی ہسپتال آئے اور بیٹی کے کان میں اذان دی۔ اسی وقت انکشاف ہوا کہ اس چینی گڑیا کی آنکھیں سرمئی ہیں۔ اگلے ہی روز ماں بیٹی گھر آ گئیں۔ میں جی بھر کر اپنی بیٹی کو پیار بھی نہ کر سکا اور چھٹی ختم ہوگئی۔

بارڈر سے گھر پر مستقل رابطہ رہتا۔ ماں اپنی پیاری بیٹی کی چھوٹی چھوٹی معصوم حرکتوں کی تفصیلات خط کے ذریعے بیان کرتی۔ امی ابو کو جب بتایا کہ میں نے اسکا نام نادیہ سوچا تھا تو اُسے سردست رد کر کے ثومیہ رکھ دیا گیا۔ سعادتمندی کا تقاضا تھا کہ میں خاموش رہتا اور پھر یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ بھی نہ تھا۔ وہ الگ بات ہے کہ چند ماہ بعد اباجی نے خود ہی میرے تجویز کردہ نام کو بہتر پایا اور نادیہ ہی ٹھہرا۔ ہمارے معاشرے میں گھٹن اب آکر قدرے کم ہوئی ہے وگرنہ ایک مدت تک صرف اولادِ نرینہ کو ہی ''ٹمنے'' پر چڑھایا جاتا تھا اور خوشیاں منائی جاتی تھیں جبکہ بیٹیوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کے مستقبل کا غم اور فکر والدین کا منہ لٹکانے کیلئے کافی ہوتا تھا۔ میں نے کم از کم اپنے خاندان کی حد تک اس روایت سے بغاوت کی اور نادیہ کی پیدائش پر لڈو بانٹے۔ جس گھر میں بھی مٹھائی پہنچی پہلا سوال یہی ہوا کہ کیا بیٹا ہوا ہے؟ جب انکی معلومات درست کی جاتیں کہ نہیں بیٹی نے آنگن کی رونق بڑھائی ہے تو شدید حیرت کا اظہار کیا جاتا یا پھر اسے مذاق گردانا جاتا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور ہم دونوں کی محبت کو جیسے نادیہ نے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دی تھی۔ نادیہ کی آمد سے قبل ہی ہم اس قدر بے صبری اور بے چینی میں مبتلا تھے کہ ہمیں اپنی

شادی کی پہلی سالگرہ تک نہ یاد رہی۔ سرحد پر تعیناتی کا عرصہ ایک بار پھر پورا ہوا۔ اور ۱۹۷۷ء کے موسم گرما کے شروع میں ہی ہم دوبارہ منگلا پہنچ گئے۔ برال کالونی میں ہمارا گھر 613- فورتھ ایونیو پھر قہقہوں اور رونقوں سے آباد ہو گیا۔ اس بار اس میں ننھی نادیہ کی کلاکاریاں بھی شامل تھیں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ہمارے پاس موجود رہتا۔ کبھی لاہور سے ممانی جان اور بچے آرہے ہیں تو کبھی راولپنڈی سے امی اور بہن بھائی۔ فرزانہ، راحیلہ اور حمیرا تو اکثر آ کر کئی کئی دن قیام کرتیں لیکن ان کے پیار کا مرکز باجی اور بھائی جان نہیں بلکہ ننھی نادیہ تھی۔ وقت گزرتا گیا اور اسی دوران ایک روز صبح دفتر کے لئے بیدار ہوئے تو معلوم ہوا کہ جنرل ضیاء الحق نے ملک میں نہایت خاموشی سے مارشل لاء لگا دیا ہے۔ یہ پانچ جولائی ۱۹۷۷ کی صبح تھی اور اسی ماہ کے اختتام پر ہی مجھے علم ہوا کہ مجھے ایک کورس کے لئے نامزد کیا گیا ہے۔ ایک طرف خوشی تھی تو دوسری جانب اُداسی بھی۔ خوشی اس بات کی کہ اس کورس کے بعد میری یونٹ سے باہر تعیناتی ہو سکتی تھی۔ فوج کا ہر آفیسر اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ یونٹ جو اس کا گھر ہوتی ہے وہاں سے باہر نکلے اور کچھ عرصہ باہر سروس کر کے واپس گھر کو لوٹے اور اُداسی اس بات کی تھی کہ مجھے دو ماہ کے لئے رخسانہ اور نادیہ سے دور رہنا تھا۔ کورس ستمبر میں شروع ہونا تھا اور اتفاق سے ستمبر کی ۱۷ تاریخ کو ہی چھوٹے بھائی طاہر کی شادی طے پائی تھی۔ چنانچہ 613 فورتھ کالونی سے تقریباً سارا ذاتی سامان قسطوں میں راولپنڈی واپس پہنچا دیا گیا۔ دوسری جانب والدین اور طاہر کے ہونے والے سسرال سے شادی کی تاریخ میں ردوبدل کی درخواست کی جو کہ باآسانی ہو سکتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ چھوٹے بھائی کی شادی کے بعد کورس کے لئے چلا جاؤں لیکن مجھے اس وقت سخت دھچکا لگا جب میری خواہش کا جواب دونوں جانب سے سرد مہری سے ملا جس کا مجھے ہمیشہ ملال رہا۔

بہرحال ستمبر کے پہلے ہفتے میں ہم دونوں نے نہایت اُداسی اور نمناک آنکھوں کے ساتھ 613 کو خیر باد کہا۔ بھلے ہم یہاں کوئی بہت طویل عرصہ نہیں رہے تھے لیکن اس

خوبصورت سے ننھے سنگل بیڈروم گھر نے ہمارے ایک مخلص دوست کا کردار ادا کیا۔ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دی۔ ہمارے پیار کو پروان چڑھایا اور ہمیں ایک دوسرے کے بیحد قریب لایا۔ میں ہی نہیں رخسانہ بھی مرتے دم تک اپنے اس پہلے گھر کو ہمیشہ یاد کرتی رہی۔ اس کی خواہش تھی کہ ہم جب بھی کبھی اپنا گھر بنائیں گے تو ایسا ہی بنائیں گے۔ افسوس کہ وہ اپنی اس دلی خواہش کو من میں لئے ابدی سکونت کیلئے روانہ ہوگئی۔

ہم نے منگلا چھوڑ دیا۔

☆ ☆ ☆

مری اور محبت

پلٹن سے کورس کے لئے روانگی کے آرڈر لیکر میں راولپنڈی پہنچ چکا تھا جہاں سے مجھے کورس کے لئے ڈیرہ اسماعیل خان روانہ ہونا تھا۔ اس انسان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی جسے صبح بھائی کی بارات کو لاہور کے لئے روانہ کرنے کے بعد خود بھی کورس کے لئے رخصت ہونا ہو۔ بہر حال میں نے جی کڑا کر کے بارات کو لاہور کے لئے رخصت کرنے کے بعد خود ڈیرہ اسمٰعیل خان کا قصد کیا۔

دو ماہ کا کورس بہت جلد گزر گیا۔ دوسری یونٹوں سے آئے بہت سے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ کچھ نئے دوست بھی بنے۔ کورس کے دوران ایک ٹور بھی ہوتا تھا جس کے لئے طالب علم افسروں کو پاکستان کے مختلف شہروں میں متعین ملٹری پولیس یونٹوں کا دورہ کرایا جاتا تھا۔ میرے لئے اس ٹور میں اضافی کشش یہ تھی کہ میرے پاس رخسانہ اور نادیہ سے ملاقات کا موقع تھا۔ کورس کا وفد راولپنڈی بھی گیا اور لاہور بھی۔ ماں بیٹی ان دنوں لاہور میں تھیں سو ایک دن ان کے ساتھ بھی گزارا۔ اللہ اللہ کر کے کورس ختم ہوا اور میری مراجعت ہوئی۔ پروگرام کے مطابق رخسانہ راولپنڈی آچکی تھی۔ میں تین دن راولپنڈی رہ کر یونٹ پہنچ گیا جو ایک مرتبہ پھر کشمیر میں مورچہ زن تھی۔

فوج میں عموماً بیگمات کی اکثریت کا فوج کے بارے میں علم واجبی سا ہی ہوتا ہے۔

افسر کرنل بن جاتے ہیں لیکن بعض کی بیگمات عہدوں، یونٹوں اور دیگر ابتدائی معلومات کے بارے میں کنفیوژ ہی دکھائی دیا کرتی ہیں۔ کم از کم ہمارے زمانے تک تو ایسا ہی تھا، ہاں اب کا مجھے علم نہیں۔ رُخسانہ کو یہ سب جاننے کا بہت شوق تھا اور وہ مجھ سے باتوں باتوں میں ایسی معلومات حاصل کیا کرتی تھی؛ کرنل بڑا ہے یا لیفٹیننٹ کرنل، بریگیڈئر کے کندھے پر کیا رینک لگتا ہے؟ ڈویژن کیا ہے، کور کیا ہے، پلٹن اور رجمنٹ میں کیا فرق ہوتا ہے؟ کسی انتظامی مسئلہ کے لئے اگر یونٹ میں فون کرنا ہے تو کس کو کرنا ہے؟ ایک دفعہ یونٹ کے کسی فنکشن میں افسران اور بیگمات گپ شپ میں مصروف تھے تو ایسی ہی کسی بات پر رخسانہ نے کسی آفیسر کی بیگم کی عہدوں کے معاملہ میں تصحیح کی۔ کرنل امتیاز جنہوں نے بلا کی حسِ مزاح پائی ہے قہقہہ لگا کر بولے، ''بھابی! آپ لگے ہاتھوں سٹاف کورس بھی کر ہی ڈالیں''۔ بات رخسانہ کے جنرل نالج کی ہو رہی تھی۔ جسے میرے اس کورس کے بعد شدت سے ہماری جلد ہی کسی اچھے اسٹیشن پر پوسٹنگ کا انتظار تھا۔ رخسانہ گھر میں جب بھی ایسی کسی خواہش کا اظہار کرتی تو امی جان کو یہ بات ناگوار گزرتی اور وہ اکثر اُسے ڈانٹ بھی دیا کرتیں کہ بہت شوق ہے علیحدہ ہونے کا؟ دراصل اس میں امی کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ خاندان میں کوئی قریبی عزیز اس سے پہلے کبھی فوج میں گیا ہی نہیں تھا۔ اس لئے انھیں یہ سمجھانا قدرے مشکل تھا کہ ایک فوجی، ماں باپ کو اپنے پاس تو لے جا سکتا ہے لیکن مخصوص حالات کے علاوہ اسکا انکے ساتھ رہنا ممکن نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہے۔

اس دوران دسمبر آیا اور ہماری پیاری بیٹی نادیہ کی پہلی سالگرہ آئی جسے ہم نے دھوم دھام سے منانے کا فیصلہ کیا۔ لاہور والوں کو بھی مدعو کیا گیا اس زمانے میں ہم ملت کالونی میں رہتے تھے۔ یہ کالونی کبھی مکھا سنگھ اسٹیٹ کہلایا کرتی تھی۔ ۱۹۷۸ء کا آغاز ہوا تو رخسانہ نے مجھے اپنے آنگن میں ایک اور کلی کے کھلنے کی نوید سُنائی۔ یہ سب کے لئے باعث مسرت بات تھی لیکن میری خوشی کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔ اسی دوران مارچ ۱۹۷۸ء کے اوائل میں مجھے وہ خوشخبری

ملی جس کا ہم دونوں کو شدید انتظار تھا۔ میرے تبادلے کے احکامات یونٹ کو موصول ہو گئے تھے۔ اور میری پوسٹنگ ایک ایم پی یونٹ میں ہوگئی تھی۔ ملٹری پولیس کے افسروں اور جوانوں کی خاکی پگڑیاں وسُرخ ٹوپیاں میرے لئے ہمیشہ ہی کشش رکھا کرتی تھیں۔ اور ربُ العزت کی مہربانی یہ کہ تبادلہ ایسی جگہ ہوا جس کا نام ہمیشہ میرا دل کھینچ لیا کرتا تھا۔ میری نئی یونٹ کوہ مری میں تھی۔ مارے خوشی کے میرا دل قابو میں نہ آرہا تھا۔ فوراً رُخسانہ کو اطلاع دی۔ خیر چند دنوں بعد یونٹ سے روانگی کا پروانہ لیکر راولپنڈی پہنچا۔ رُخسانہ کی خوشی دیدنی تھی لیکن باقی گھر والوں خصوصاً امی ابا جی نے اس خبر پر سردمہری کا اظہار کیا۔ مجھے علم تھا کہ اس میں بھی ان کا پیار چھپا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ مجھے اب آگے دیکھنا تھا اپنے جیون ساتھی سے عہد کیا کہ جاتے ہی گھر الاٹ کرانے کی کوشش کروں گا اور جب تک گھر نہیں ملتا کسی بھی میس میں کمرہ لینے کی کوشش کروں گا۔

رُخسانہ کو ویسے بھی مخصوص حالات کیوجہ سے کسی پُرفضاء مقام پر لیجانا ضروری تھا سو اپنے آفیسر کمانڈنگ کے تعاون سے میں ایک میس میں دو کمروں کا سیٹ لینے میں کامیاب ہوگیا اور رخسانہ کو ساتھ لے گیا۔ پڑوس کے سیٹ میں ایک اور افسر اپنی بیگم کے ساتھ مقیم تھے۔ ان دونوں کی سارا دن اچھی گپ شپ رہتی۔ کھانا میس سے آجایا کرتا اور بادل برسات کے خوبصورت نظارے مفت میں۔ اس دوران میں گھر الاٹ کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ اگست ۱۹۷۸ء سر پر آن پہنچا تو رخسانہ کو واپس راولپنڈی بھجوانے کا خیال آیا کیونکہ ستمبر میں نئے مہمان کی آمد متوقع تھی۔ خیال تھا کہ چونکہ مری نزدیک ہے سو ویک اینڈ پر خود بھی چکر لگا لیا کروں گا۔

گیارہ ستمبر قائداعظم کی وفات کا دن تھا لیکن اسی روز رب کریم نے مجھے اولاد نرینہ عطا فرمائی۔ دن کے ساڑھے گیارہ بجے شہریار سہیل صاحب اس دنیا میں تشریف لائے۔ گو کہ اس وقت میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ چھتیس سال بعد یہ تاریخ میرے آنگن میں کیا قیامت ڈھائے گی۔ میں سی ایم ایچ پہنچا تو رخسانہ کو وارڈ کی جانب لیجایا جا رہا تھا میں نے کوریڈور میں

ہی سٹریچر روکا اور بے اختیار اپنی عزیز از جاں رفیق سفر کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ اس کے ساتھ جو لیفٹیننٹ نرس تھی وہ مسکرا کر بولی،

''سر آپ اپنی مسز سے بہت پیار کرتے ہیں''؟

آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے جذباتی سی مسکراہٹ کے ساتھ میرا جواب تھا،

''کیا اس پر پابندی ہے''؟

مجھے مری میں گھر الاٹ ہو چکا تھا۔ یہ ایک خوبصورت اور قدیم گھر تھا بلکہ شاید اب بھی ہے جو کبھی نہ بھول سکوں گا۔ ٹین کی چھتوں، لکڑی کے فرش اور پتھروں کی دیواروں کا بنا کم وبیش ایک صدی پرانا تاریخی کاٹیج جس کا ''ایشلے لاج'' کے نام سے کتابوں میں بھی ذکر ہے، لارنس کالج روڈ پر مری سے نکلتے ہی پنجاب ہاؤس سے ذرا پہلے ایک خوبصورت ڈھلوان پر واقع ہے۔ لوگ عموماً نئے اور جدید گھر ڈھونڈتے ہیں لیکن مجھے ہمیشہ سے ایسے قدیم، پرسرار بھوت بنگلے پسند رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کچھ قدیم فرنیچر بھی یہاں پڑا تھا جو کم از کم سو سال سے زیادہ پُرانا تو ہوگا ہی۔ میں رخسانہ، نادیہ اور شہر یار کو لیکر آ گیا۔ ضرورت کا کچھ سامان بھی منتقل کیا۔ میرے گھر کی رونقیں بڑھ گئی تھیں۔ جس کے لئے میں رب العزت کا جتنا بھی شکر ادا کرتا کم تھا۔ بزرگوں کی اس بات میں بیحد سچائی ہے کہ تکلیف و آزمائش کے لمحے بھی سال لگتے ہیں جبکہ خوشی و شادمانی کے سال پلک جھپکتے لمحوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔

دسمبر سر پر آن پہنچا۔ ہم دونوں نے پروگرام بنایا کہ نادیہ کی دوسری سالگرہ پہلے سے زیادہ دھوم دھام سے منائی جائے۔ سوچا اسی بہانے عزیز و اقارب مری کی سیر بھی کر لینگے۔ دراصل مری کا پروگرام بنانے کا کم از کم میں نے جب بھی سوچا تو سب سے پہلے ہوٹل کے کمروں کے کرائے سے ہول اُٹھتا تھا۔ ''گنجی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا'' کے مصداق، فوجی بھائیوں کی ویسے ہی لگی بندھی تنخواہ ہوتی ہے۔ ایسے میں مری کا اسٹیشن اور پھر خوبصورت

گھر کا ملنا کسی صورت بھی نعمت باری تعالی سے کم نہیں تھا، سو دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ عزیز و اقارب بھی مستفیض ہوں؟ آخر اٹھائیس دسمبر آن پہنچا۔ لاہور سے ممانی جان، فاروق، فرزانہ، راحیلہ اور دردانہ جبکہ پنڈی سے امی، ابا جی، طاہر، زبیر، حمیرا، عامر اور بہت سے دوست احباب پہنچ گئے۔ ایک دوست کا اپنا بینڈ گروپ تھا جو اس زمانے میں کم کم ہی ہوتا تھا۔ اس نے بھی خوب رنگ جمایا۔ مجھ سمیت کئی شوقیہ فنکاروں نے بھی اپنی بے سُری آوازوں سے خاصی سمع خراشی کی۔ ایک آدھ روز میں سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ رخسانہ نے مہمانوں کی خدمت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ اور یہ خوبی اسکی گھٹی میں تھی۔ ایک مدت تک سب اس یادگار اکٹھ کا تذکرہ کرتے رہے۔

نادیہ کی سالگرہ کے دو ہی روز بعد مری کو گہرے مہیب بادلوں نے گھیرنا شروع کر دیا ایسے سیاہ بادل، ایسا سکوت، میں نے زندگی میں کبھی نہ دیکھا نہ سُنا تھا۔ مقامی لوگوں سے معلوم ہوا کہ برفباری کی نشانی ہے۔ اتفاق یہ کہ میں نے زندگی میں کبھی برف باری بھی ہوتے نہیں دیکھی تھی اور چونکہ یہ پہلا موقع تھا سو بے صبری سے انتظار شروع ہو گیا۔ جب رخسانہ سے اپنے اشتیاق کا اظہار کیا تو اس نے کوئی زیادہ دلچسپی نہ ظاہر کی اور یہ میرے لئے ایک اور بریکنگ نیوز تھی لیکن سب سے دلچسپ اور ناں بھولنے والی بات یہ ہوئی کہ سالِ نو کی رات تھی اور میں لاج کی دہلیز پر کیمرہ لئے بیٹھا، بے چینی سے برف باری کا منتظر تھا کہ اچانک آسمان سے خوبصورت روئی کے ننھے گالوں نے اُترنا شروع کر دیا۔ ابتدأ میں انکا ڈھلکنا سست رفتار رہا لیکن پھر یکلخت تیزی آ گئی۔ اس سحر انگیز منظر نے مجھے دیوانہ کر دیا میں چلاتا ہوا اندر بھاگا،

''رخسانہ، رخسانہ اُٹھو''

بیگم صاحبہ نے ناگواری سے نیم وا آنکھوں سے پوچھا،

''کیوں کیا ہوا ہے''؟

میں نے پہلے جیسے والہانہ انداز میں کہا،

''باہر آ کر دیکھو برفباری ہو رہی ہے بہت خوبصورت منظر ہے''

جواب ملا، ''جائیں۔۔۔آپ دیکھیں مجھے سونے دیں نیند آ رہی ہے''۔

گو وقتی طور پر تو مجھے اس جواب سے دھچکا لگا لیکن اس کے جواب پر غور کرنے کے بعد مجھے بے حد ہنسی آئی۔ بعد کی زندگی میں اکثر ملنے جلنے والوں اور عزیز و اقارب سے اس واقعہ کا لطیف پیرائے میں ذکر کرتا تو سب لطف اندوز ہوتے۔ میں برف باری میں اکثر یہ دیکھے بغیر کہ دن ہے یا کہ رات، لانگ بوٹ کستا اور کیمرہ کاندھے پر لٹکائے عکاسی کے لئے نکل کھڑا ہوتا۔ ہم ملکہ کوہسار میں لگ بھگ سال سوا سال مقیم رہے لیکن یہ بھی یادگار اور نہ بھولنے والا عرصہ تھا۔ ۱۹۷۹ء کے وسط میں یونٹ کے تبادلے کے احکامات آ گئے اور ہم گرفتہ دل کے ساتھ کھاریاں کے لئے روانہ ہو گئے۔

کھاریاں منتقل ہونے کے بعد ہم نے سارا ساز و سامان پنڈی سے منگوا لیا۔ ہمارے نئے کمانڈنگ آفیسر چونکہ کنوارے تھے سو چار بیڈ رومز پر مشتمل یہ گھر میرے حصے میں آیا۔ خوبصورت وسیع لان والا یہ گھر کھاریاں کی نارتھ کالونی میں تھا۔ ننھی نادیہ اور شہر یار خوب کھیلتے اور انکی کلکاریاں اور توتلی باتیں اس ننھی سی جنت میں رونق کا باعث بنتیں۔ کھاریاں میں رہتے ہوئے میرے سر پر پرائیوٹ طور پر گریجویشن کرنے کا بھوت سوار ہوا اور میں نے لگے ہاتھوں بی اے کر ڈالا۔ مری میں کوئی باقاعدہ کالونی نہ ہونے کے سبب اڑوس پڑوس مفقود تھا لیکن کھاریاں میں خواتین کی زندگی خاصی سوشل تھی۔ اپنی دوستانہ طبیعت اور ملنساری، خوش مزاجی کی وجہ سے رخسانہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنالیتی تھی۔ جلد ہی اس نے خواتین کا ایک حلقہ احباب بنالیا۔ بہت سے کنبے ایسے ہیں جن سے اب تک رابطہ ہے۔

کھاریاں ایک خاموش اور پرسکون چھاؤنی ہے۔ دفتر سے واپسی پر ہمارا زیادہ وقت دونوں بچوں کے ساتھ گزرتا۔ گاہے بگاہے لاہور راولپنڈی کے چکر بھی لگتے رہتے۔ کوئی ایک سال کے لگ بھگ کھاریاں میں قیام رہا اور پھر فوج کے ضابطے کے مطابق میرے لئے اپنی

پلٹن کو واپسی کے احکامات آ گئے۔ یہ غالباً جولائی ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ میری پلٹن اس وقت سیالکوٹ میں تھی۔ رخسانہ کو سیالکوٹ جانے کی خوشی تھی کیونکہ یہ اس کے والدین کا آبائی شہر تھا جہاں ہم دونوں کے کچھ عزیز ہنوز مقیم تھے۔ لیکن جب گھر ملنے کے معاملہ میں دشواری پیش آئی تو جلد ہی اس کی خوشی کافور ہو گئی۔ فوجی معاملات اور مشقوں کے حوالے سے سیالکوٹ خاصا مصروف کنٹونمنٹ گردانا جاتا ہے۔ میں نے یونٹ کے ایک ساتھی افسر کا گھر مستعار لیا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو موسیقی سے شغف تھا سو، یہیں ہم نے چند ماہ تک رقم جوڑ کر اپنا پہلا ذاتی موسیقی کا ڈیک لیا جو ہمارے لئے بڑی بات تھی۔ اکثر شام یارات میں اکٹھے بیٹھ کر اپنی پسند کے گانے سُنا کرتے۔ رخسانہ کی مخصوص عادت تھی کہ جب بھی کوئی گانا لگایا جاتا یا میں کبھی گنگناتا تو وہ فوراً سے پیشتر ساتھ میں گنگنانا شروع کر دیتی اور میں اکثر اس کی اس عادت کا مذاق اُڑایا کرتا۔

وقت گذرتا رہا تاوقتیکہ ایک روز دوپہر کے وقت پلٹن کے تربیتی میدان میں، میں اپنی کمپنی کی تربیت کی نگرانی کر رہا تھا کہ اچانک دور سے سائیکل پر مجھے اپنا اردلی ہانپتا کانپتا نظر آیا۔ پھولے سانس کے ساتھ اس نے انکشاف کیا،

''سر! باجی اچانک بے ہوش ہو کر گر گئیں ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ پانی کے چھینٹے مارے لیکن جواب نہیں دے رہی ہیں۔ گھر کو تالا لگا کر آیا ہوں''۔ میں نے اس سے گھر کی چابی لی، اپنے کمپنی افسر کو خیال رکھنے کا کہا اور موٹر سائیکل لے کر گھر کی طرف بھاگا۔ لگتا تھا کہ جسم سے خون خشک ہو گیا ہے اور ٹانگوں میں جان نہیں۔ گھر جا کر دروازہ کھولا تو رخسانہ کو سامنے کرسی پر شدید نقاہت کی حالت میں بیٹھا پایا۔ وہ بمشکل سانس لے رہی تھی دونوں معصوم ماں کے پاس پریشان کھڑے تھے۔ میں نے چھوٹتے ہی پوچھا،''چھاناں! کیا ہوا؟ خیریت تو ہے ناں''؟

''خیر نہیں بس آج چلی ہی گئی تھی۔ میرا سانس رک گیا تھا''، اُس نے اکھڑتے ہوئے سانس کے ساتھ جواب دیا۔

''پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا''؟ میں نے استفسار کیا تو بتانے لگی کہ اسے ہلکا پھلکا

سانس کا مسئلہ تو بچپن سے ہی تھا اور ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ یہ دمہ نہیں لیکن بگڑ کر دمہ بن سکتا ہے۔ مجھے دونوں کی جبکہ رخسانہ کو اس ننھی کلی کی اپنے سے زیادہ فکر تھی جو چند ماہ تک ہمارے آنگن کا پھول بننے والی تھی۔ یہ کسی شدید بیماری کا رخسانہ پر پہلا وار تھا۔ میں اردلی کو بچوں کے پاس چھوڑ کر اُسے موٹر سائکل پر بٹھا کر سی ایم ایچ لے گیا۔ سپیشلسٹ نے بغور معائنہ کیا اور ہمیں بُری خبر سُنائی کہ یہ استھما کا حملہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو مزید فکر اس وقت لاحق ہوئی جب انہیں علم ہوا کہ وہ اُمید سے تھی بہر حال کرنل صاحب نے اُسے ہسپتال داخل کر لیا۔ ڈاکٹروں کے پینل نے بہت مشورے کئے اور دیئے بھی لیکن وہ کسی بھی صورت نئے مہمان سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ بہر حال جب وہ بہتر ہو کر گھر آئی تو مجھ سے خواہش کا اظہار کیا کہ جب آپ نومبر کے شروع میں تربیتی مشقوں کے لئے جائیں گے تو مجھے لاہور بھجوا دیجئے گا۔ میں اس دفعہ امی کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ میں نے فوراً ہامی بھر لی اور اکتوبر ۸۰ء کے اختتام پر ہی میں نے اُسے بچوں سمیت لاہور بھجوا دیا اور کچھ دنوں بعد ہی اپنی یونٹ کے ساتھ تربیتی مشقوں کیلئے میدانوں کا رُخ کیا۔

رخسانہ کی بیماری کی خبر نے مجھ پر گہرا اثر مرتب کیا تھا۔ اب مجھے ہر وقت اس کی فکر لاحق رہتی تھی۔ اسکی بیماری مجھ میں ایک بہت بڑا انقلاب لائی۔ یہ غالباً ۲۶/اکتوبر ۱۹۸۰ء کی ایک رات کا ذکر ہے۔ عشاء کا وقت تھا اور میں اپنے خیمے کے باہر چارپائی پر لیٹا آسمان پر ستاروں کو گن رہا تھا۔ خیالات کا تانا بانا اُلجھا تو خیال آیا کہ کئی ستارے جو اس وقت چمکتے نظر آ رہے ہیں، انہیں فنا ہوئے بھی صدیاں بیت چکی ہونگی۔ ستاروں سے بات انسانوں پر اور پھر خالق اور مخلوق کے تعلق تک خیالات کی ڈوری جا پہنچی۔ سوچا کہ میں نے زندگی کے تیس سال ایسے ہی گزار دیئے اور اگر آج رب تعالیٰ واپس بلا لے تو مجھ تہی دامن کے پاس تو کچھ بھی نہیں ۔

پیش کر غافل اگر، کوئی عمل دفتر میں ہے۔

میں کانپ کر رہ گیا اور ارادہ کیا کہ صبح سے با قاعدہ نماز شروع کروں گا۔ ضمیر نے فوراً

خبر دار کیا کہ پھر آ گئے نا شیطان کے بہکاوے میں؟ کیا ضمانت ہے کہ تم کل کی صبح دیکھ بھی سکو گے یا نہیں۔ میں بے چین ہو کر اُٹھا، یخ بستہ پانی سے وضو کیا اور عشاء کی نماز ادا کی۔ بعد نماز سجدے میں گر کر اللہ تعالی سے گڑ گڑا کر معافی طلب کی۔ چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا اور دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہو گیا۔ یہ میری با قاعدگی سے نمازوں کی ابتدا تھی، رہی قبولیت کی بات تو قبول یا رد کرنا اس بے پرواذات باری تعالی کا کام ہے۔ اگلے روز فجر کی نماز پر مجھے رخسانہ اور آنے والے مہمان کا خیال آیا تو اس وقت دونوں کی صحت اور زندگی کی دُعا کو اپنی نمازوں کا حصہ بنالیا صرف یہی نہیں بلکہ دونوں کی صحت، سلامتی کے لئے آیت کریمہ کا وظیفہ بھی شروع کر دیا اور عہد کیا کہ سوالاکھ دفعہ آیت کریمہ تنہا پڑھوں گا۔ میرے مالک نے مجھے توفیق اور ہمت دی اور میں مشقوں کے دوران اس ورد کیلئے کسی نہ کسی طرح وقت نکال لیا کرتا۔ مشقوں کے علاقے میں ہی ایک روز مجھے خوشخبری ملی کہ اللہ نے مجھے بیٹی عطا کی ہے۔ میں اکثر کہتا ہوں کہ بیٹیاں میں نے اللہ سے مانگ کر لیں اور بیٹے اللہ نے انعام میں دیئے۔ مشقوں کے اختتام پر جونہی یونٹ سیالکوٹ واپس پہنچی میں فوراً چھٹی لے کر، اپنی ننھی گڑیا اور رخسانہ سے ملنے کیلئے لاہور کو بھاگا۔ میری خواہش تھی کہ نام بیلاؔ رکھوں لیکن والدین کا اصرار تھا کہ کوئی اور نام رکھوں۔ چنانچہ جویریہؔ پر سب متفق ہوئے۔ وہ الگ بات ہے کہ آج تک سب اُسے بیلا ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ میرے آنگن کی رونق میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ نادیہ، شہریار اور اب جویریہ تینوں میں آپس کا کم وبیش دو دو سال کا فرق تھا۔ اسی دوران ہمیں باقاعدہ گھر بھی مل گیا تھا۔ بھوانی ٹائپ کا یہ گھر اتاترک روڈ پر واقع تھا۔ رخسانہ کو گھر کی آرائش وسجاوٹ کا بیحد شوق تھا اور میں ٹھہرا ایک کپتان جس کی لگی بندھی تنخواہ تھی۔ قطرہ قطرہ جوڑ کر ایک موٹر سائیکل خریدا تھا، جس پر ان سب کو بٹھا کر سفر کرنا کرتب دکھانے سے کم نہ تھا۔ ہاں جدی پشتی امیر گھرانوں سے تعلق رکھنے والے افسران تو لفٹین ہو کر بھی گاڑیاں رکھتے تھے لیکن اس خاکسار کو اللہ نے بے پناہ قناعت عطا فرمائی ہے۔ الحمدللہ کبھی کسی کی حیثیت سے متاثر نہیں ہوا۔ مجھے سیالکوٹ ہی سے ایک کورس کے

سلسلے میں کوئٹہ جانا پڑا۔کورس ختم ہونے سے چند ہفتے قبل نجانے میرے دل میں کیا سمائی کہ میں نے موٹر سائیکل بیچ ڈالی اور رُخسانہ کی پسند کی گھر کی بیشمار الیکٹرانک کی اشیائے ضرورت جن کا تعلق رسوئی سے تھا خرید ڈالیں۔ یہ رخسانہ کے لئے بہت بڑا سرپرائز تھا۔اچانک اتنا کچھ اپنے سامنے پاکر اس کی خوشی دیدنی تھی اور میں اسکی مسکراتی آنکھوں اور کھلے چہرے کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سمارہا تھا۔

یونٹ کا سیالکوٹ میں وقت پورا ہورہا تھا۔اور اُسے ایک بار پھر کسی کٹھن اور دشوار علاقے (Hard Area) میں جانا تھا۔قرعہ ایک مرتبہ پھر کشمیر کے نام کا نکلا۔ رخسانہ کی خواہش تھی کہ وہ چونکہ تین بچوں کے ساتھ اکیلی کسی چھاؤنی میں نہیں رہ سکے گی لہٰذا اسے لاہور بھیج دیا جائے۔ میں نے امی سے رسماً اجازت لی اور جہاندیدہ ماں نے مجھے بخوشی اجازت دے دی۔گو کہ رخسانہ کو سیالکوٹ سے لاہور بھیج کر میں یونٹ کے ہراول دستہ کے ساتھ کشمیر چلا گیا لیکن رخسانہ کی ناگہانی بیماری کے بعد سے میں اس کے بارے میں بہت زیادہ فکر مند رہنے لگ گیا تھا۔

شہرِ گردو گدا میں

کشمیر میں میرا اور یونٹ کا ساتھ کوئی سال بھر کیلئے رہا۔ اس دوران اکثر لاہور اور اسلام آباد کے چکر بھی لگتے رہتے۔ والدین راولپنڈی والا گھر فروخت کر کے اسلام آباد کے G-9 سیکٹر منتقل ہو چکے تھے ہمشیرہ حمیرا بھی بیاہ کر اپنے سسرال رخصت ہو چکی تھی۔ زندگی مخصوص ڈگر پر سبک خرامی سے رواں دواں تھی۔ سن ۱۹۸۲ء کا غالباً مارچ یا اپریل کا مہینہ تھا جب ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا اور مجھے فوج کی خوبصورت اور دل موہ لینے والی رسومات سے ایک مرتبہ پھر واسطہ پڑا۔ عید کا موقع تھا اور اس مرتبہ عید پر پلٹن میں رکنے والوں میں، میں بھی شامل تھا۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر کے چھوٹے سے میدان میں عید کی نماز اور دُعا کے بعد کرنل صاحب، خطیب صاحب کے برابر میں آئے اور عید کے اجتماع سے مخاطب ہوتے ہوئے میرا نام لے کر مجھے آگے آنے کو کہا۔ اس ناگہانی بلاوے پر میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ سوچنے لگا کہ یااللہ! ایسا کیا ہوا کہ مجھے یونٹ کے سامنے طلب کیا جا رہا ہے؟ خیر کرنل صاحب کے پاس پہنچا تو اچانک ایڈ جوٹنٹ بھی کھڑا ہو گیا اور نہ جانے کہاں سے میجر کے عہدے کے رینک طشتری میں لئے، باوردی جوان نمودار ہوا۔ کرنل صاحب نے سیکنڈ ان کمانڈ کی مدد سے میرے کندھوں پر سے کپتانی کا بوجھ اُتارا اور میجر کا عہدہ تنصیب کر دیا۔ وزن میں کپتانی کے پھول زیادہ مگر ذمہ داری میں ہلکے جبکہ میجر رینک کا چاند ستارہ وزن میں ہلکا جبکہ ذمہ داری بہت بھاری ہوتی ہے۔

اچھا تو یہ ڈراما تھا؟ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ خوشی بھی بہت ہوئی اللہ کا شکر بھی ادا کیا۔ عید کے تیسرے روز جب افسران کی چھٹی سے واپسی ہوئی تو میں یہ خوشخبری لئے رخسانہ اور بچوں سے ملنے چلا گیا۔

وقت گزرتا رہا، بچے بھی ماشا اللہ بڑے ہو رہے تھے اپنی معصوم حرکتوں سے محظوظ کرنے کے علاوہ کبھی کبھار تارے بھی دکھایا کرتے تھے۔ ایسے میں ماں باپ کی اور قدر آتی تھی کہ انھوں نے ہمیں کیسے پالا پوسا ہوگا۔ اس دوران ۱۹۸۳ء آن پہنچا تھا۔ اور پھر ماہ فروری میں میری نئی تعیناتی کے احکامات آ گئے۔ اس بار گرد، گدا، گرما و گورستان کا شہر ملتان میری منزل ٹھہرا۔ مارچ ۱۹۸۳ء کے وسط میں میں نئے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ گھر ایک مرتبہ پھر خوبصورت ترین ملا یہ پرانی فورٹ کالونی میں تھا۔ وسیع وعریض لان، روشن اور ہرا بھرا۔ بچوں کے سکول جانے کی عمریں تھیں۔ اور اتفاق سے فارمیشن کا اسکول کالونی میں ہی تھا۔ اور بچے اسی سکول میں داخل کرا دئے۔

رخسانہ کی ایک بہت بڑی کمزوری تھی کہ وہ بچوں کو پڑھاتے وقت صبر و برداشت کا دامن چھوڑ دیتی تھی۔ کسی بچے نے ایک سے دوسری بار سبق میں کوئی غلطی کی نہیں اور اچانک زناٹے کا تھپڑ رسید ہو جاتا۔ نتیجتاً مجھے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے پڑتے۔ میں اکثر اسے کہا کرتا تھا کہ بچوں کے لئے تم باقی معاملات میں بے حد نرم ہو بے جا لاڈ کرتی ہو لیکن پڑھاتے ہوئے تم جلّاد بن جاتی ہو، ایسا کیوں ہے؟ اس کے برعکس بچوں کی تربیت کے معاملے میں، میں خاصا سخت تھا اور تقریباً تربیت اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔ دوستی کے وقت ان سے ناقابلِ یقین حد تک دوستی ہوتی اور پڑھائی میں جس بلا کی برداشت کا میں مظاہرہ کیا کرتا تھا اس پر میں اکثر خود بھی حیران ہوا کرتا تھا۔ مجھے صرف اس وقت غصہ آتا جب بچوں میں سے میرے سامنے کوئی بھی حاضر بچہ ذہنی طور پر غیر حاضر ہوتا جس کا مجھے فوراً علم ہو جاتا۔ بچے بھی اس بات کو خوب جانتے تھے سو جب بھی کتابیں لیکر میرے

سامنے بیٹھتے، حواس مجتمع کر کے اور دماغ حاضر کر کے بیٹھتے۔ رخسانہ جب یہ سب دیکھتی تو فقرہ کسے بغیر نہ رہتی کہ یہ سب ڈنڈے کے گاہک ہیں۔

مارشل لأ کا زمانہ تھا اور میرے شب وروز فرائض کی انجام دہی کے حوالے سے خاصے ہنگامہ خیز ہوا کرتے تھے اس کے باوجود ہماری سوشل زندگی خاصی رونق انگیز تھی۔ فوج کے حلقے میں بھی چند خاندانوں سے خاصا ملنا جلنا تھا جن میں سے کچھ سے تو بزرگوں کے زمانے کے تعلقات تھے۔ کھانے، افطاریاں بچوں کی سالگرہیں اکھٹا ہونے کے بہانے ہوا کرتے تھے۔ بھلے کوئی موقع نہ بھی ہو لیکن وجہ پیدا کر لی جاتی تھی۔ فوجی حلقوں میں میجر حسن امام جن کا بعد میں انتقال ہو گیا انکی اہلیہ نزہت آپا، کرنل توقیر الاسلام اور انکی بیگم، کرنل (بعد میں جنرل) توقیر ضیأ، میجر (بعد میں بریگیڈئر) جنید اور انکی ہنس مکھ اہلیہ بینا اور کیپٹن راحیل اور ان کی اہلیہ سیمی راحیل جو بعد میں ٹی وی ڈراموں سے بہت نامور ہوئیں اور کئی دوسرے خاندان جبکہ سول میں امی ابا جان کے پرانے ملنے والے اور مشہور عالمِ دین سید نورالحسن شاہ بخاری صاحب کا کنبہ، ایک اور دیرینہ خاندانی دوست ضمیر احمد خان غوری (اداکار فاروق ضمیر کے والد) کی ہمشیرہ اور بھانجی نعمانہ شامل تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ دوستوں کے حوالے سے وہاں میاں ابرار سے بھی روابط قائم ہوئے۔ ادب اور فنون لطیفہ کے حلقوں میں نامور عکاس ذوالفقار بھٹی، آرٹس کونسل کے کرتا دھرتا واسطی اور والد صاحب کے دوست عرش صدیقی صاحب سے بھی رابطہ رہتا۔

یہاں ملتان والے گھر کا وسیع لان دیکھ کر میرا دل مچلا اور پالتو جانور رکھنے کا پرانا شوق ایکبار پھر سے عود کر آیا۔ رفتہ رفتہ میں نے چڑیاں، طوطے اور دیگر جانور جمع کرنے شروع کر دیئے۔ ہرن، کونجیں، بطخیں، کئی قسم کے طوطے، ایرانی بلیاں، جرمن شیپرڈ کتے غرض یہ کہ کونسا جانور یا پرندہ تھا جو میں نے نہیں رکھا۔ رخسانہ کو شاید اپنی سانس کی بیماری کی وجہ سے یہ سب ناپسند تھا۔ لیکن اگر وہ خوشی کا اظہار نہیں کرتی تھی تو احتجاج بھی نہیں ہوتا تھا مگر میرے بچوں کی خوشی دیدنی تھی۔ رفتہ رفتہ کالونی کے بچوں کو پتہ چلا تو ہمارے گھر میں بچوں کی آمد ورفت زیادہ

ہو گئی۔ بہت بعد میں مجھے علم ہوا کہ کالونی کے بچوں نے میرا نام طوطوں والے انکل رکھا ہوا تھا۔

ملتان میں شامیں بہت خوبصورت ہوا کرتی تھیں جنھیں رُخسانہ کی زندہ دلی اور گھر گرہستی کا شوق مزید جلا بخشتا تھا۔ کبھی ہم دونوں کے والدین نے آنا تو رخسانہ نے انکو سر آنکھوں پر بٹھالینا اور خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑنی۔ کھانے پکانے اور سلائی بنائی میں رُخسانہ کو ملکہ حاصل ہو چکا تھا۔ وہ ننھا سا آشیانہ جو آٹھ برس قبل وجود میں آیا تھا، اللہ کے فضل وکرم اور رخسانہ کی محبت اور لگن سے تھوڑے ہی عرصہ میں گھر لگنے لگا تھا۔ بحیثیت فنکار گھر کی اندرونی آرائش وزیبائش سے مجھے خاصی دلچسپی تھی۔ سو رخسانہ کو چھٹی والے دن کا انتظار ہوتا تا کہ مجھے قابو کرے۔ فریم ٹانگنے، کمروں کی سیٹنگ میں ردوبدل، پوسٹر لگانے کے لئے مجھے اکثر اپنا چھٹی کا دن قربان کرنا پڑتا۔ اُسے معلوم تھا کہ میری تھکان کیسے اُترتی ہے۔ سو شام کے قریب بہترین چائے اور ساتھ کھانے پینے کی دو چار چیزیں بنا کر وہ میری سٹڈی میں آجاتی جہاں ہم دونوں قالین پر بیٹھ کر چائے پیتے، موسیقی سے لطف اندوز ہوتے اور پرانی یادیں تازہ کرتے جبکہ دوست احباب ہمارا سلوک، محبت اور گھر کی رونق دیکھ کر رشک کیا کرتے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہماری کبھی کوئی جھڑپ نہ ہوئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر جھڑپیں سرحدی نوعیت کی ہوا کرتی تھیں بعض اوقات تو معمولی معمولی باتوں پر جنہیں سن کر بے اختیار ہنسی چھوٹ جائے لیکن شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے تکلف کا رشتہ روا نہیں رکھا ہوا تھا تاہم دلچسپ بات یہ تھی کہ تکرار کے کچھ ہی دیر بعد ہم معاملہ سلجھانے اور فائر بندی کے منتظر ہوتے۔ یہ انتظار ہوتا کہ کون پہل کریگا۔ زیادہ خاموشی دونوں کو کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ عموماً پہل وہی کرتا جس کی غلطی ہوتی لیکن صلح ہو جانے پر ہم دونوں جو لطف اُٹھاتے اس کا اندازہ صرف ہم ہی کر سکتے تھے۔

بچے گھر کی رونق بڑھاتے رہتے لیکن کبھی کبھار اونچ نیچ بھی ہو جایا کرتی، خاص طور پر شہریار بچپن میں خاصا کمزور تھا اور اس کے ہسپتال کے چکر معمول تھا۔ ایسے میں میری چھوٹی

خواہر نسبتی راحیلہ، جو سالی کم اور بیٹی زیادہ تھی وہ آن کال رہتی۔ جونہی کوئی ایسا موقع آتا فوراً تار ہلا دئے جاتے اور اگلے ہی روز راحیلہ ہمارے پاس موجود ہوتی۔ آفرین ہے اس پر کہ ان تمام تر مخل اندازیوں کے باوجود اس نے نمایاں حیثیت سے گریجویشن کر ہی ڈالی۔

ملتان ہی میں رخسانہ پر دوسری دفعہ استھما کا دوسرا بڑا حملہ ہوا اور اُسے کچھ روز ہسپتال میں رہنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے پچھلی ہسٹری دیکھی تو اُسے متنبہ کر دیا کہ فصلوں کی کٹائی کے موسم میں وہ میدانی علاقوں سے دور رہے۔ اس اٹیک کے بعد میری پریشانی مزید بڑھ گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ڈھائی سال گزر گئے۔ ایک مرتبہ پھر میرے لئے کوچ کا نقارہ بج چکا تھا۔ مجھے اب پھر پلٹن میں واپس جانا تھا اور پلٹن ہنوز کشمیر میں اسی مقام پر تھی جہاں چھوڑ کر آیا تھا۔ ملتان کے عرصہِ قیام نے ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا بہت موقع دیا۔ میں ٹھہرا فوجی جسے تنہا پہاڑوں، میدانوں اور سرحدوں پر رہنے کی عادت سی ہو چلی تھی لیکن مجھے نظر آرہا تھا کہ رخسانہ کے لئے اب اکیلا رہنا مشکل ہے۔ یونٹ کشمیر میں تھی لیکن افسران کے اہل وعیال منگلا میں رہتے تھے۔ رخسانہ کو منگلا کا شادی کے بعد پہلا پڑاؤ کبھی نہیں بھولا تھا سو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اُسے اب نہ لاہور رہنا ہے اور نہ ہی اسلام آباد بلکہ اب وہ صرف اور صرف منگلا میں رہے گی۔ یونٹ نے فوری طور پر گھر کی فراہمی سے معذوری ظاہر کی لیکن ایسے میں نعیم بھائی کام آئے۔ نزہت باجی بھی قریبی عزیز تھیں اور ہم لوگ بچپن سے اکٹھے پلے بڑھے تھے۔ کرنل نعیم ان کے شوہر، اتفاق سے اسٹیشن ہیڈکوارٹر میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے میرے پہنچنے سے قبل ہی گھر الاٹ بھی کروا دیا۔ اور رنگ وروغن بھی کروا دیا۔ ان کے بچوں لبنیٰ، خرم اور فیصل کو ہم دونوں سے بیحد انس تھا اور انہیں نہایت بے صبری سے ہمارا انتظار تھا۔ جون ۱۹۸۵ء میں ہم نے ملتان کو خیر باد کہا اور منگلا جا پہنچے۔ منگلا پہنچتے ہی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ کیونکہ اب کی بار جو گھر ملا وہ ایک مرتبہ پھر فورتھ ایونیو میں تھا اور دس سال پہلے ملنے والے گھر کے تقریباً سامنے تھا۔ ہم دونوں کو اس حسین اتفاق پر بیحد خوشی ہوئی۔ سامان وغیرہ سیٹ کرنے

کے بعد ہم سب سے پہلے اس گھر میں رہنے والے جوڑے سے ملنے گئے۔ اور نہیں پس منظر بتایا کہ ہمیں اس گھر سے کیوں پیار ہے۔ انہوں نے ہمیں سارا گھر خاص طور پر دکھایا ہر چیز اُسی طرح تھی لیکن مکین ہم نہیں تھے۔

بچوں کو سیٹ کر کے اور اللہ کے بعد باجی نزہت اور نعیم بھائیجان کے حوالے کر کے میں نے بارڈر کی راہ لی جہاں مجھے یونٹ میں رپورٹ کرنا تھی۔ پندرہ روز بعد جب میں پہلی دفعہ ویک اینڈ پر منگلا آیا تو رخسانہ کے اڑوس پڑوس کی خواتین سے تعلقات اور مقبولیت دیکھ کر یوں لگا جیسے رُخسانہ گزشتہ نو دس سال سے یہیں رہائش پذیر ہے۔ میرے لئے یہ بات باعث فخر ومسرت تھی کہ میری رفیق زندگی کو لوگوں کو گرویدہ کرنا اور حلقۂ احباب بنانا آتا ہے۔

گو اس دفعہ ہم منگلا سال سے بھی کم عرصہ رہے لیکن یہ بھی یادگار وقت تھا۔ یہیں پر ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ رخسانہ کا غیر معجّل حق مہر مبلغ دس ہزار روپے میرے ذمہ تھا جو منگلا کے اس عرصہ میں ہی میں نے اُسے ادا کر دیا۔ چند روز بعد یونٹ کے ایک آفیسر نے اپنی فاکس ویگن کار جو خاصی مخدوش حالت میں تھی بیچنے کے لئے کھڑی کی اور اتفاق سے اس کی ڈیمانڈ صرف دس ہزار روپیہ تھی۔ میں نے رخسانہ سے سرسری ذکر کیا تو کہنے لگی آپ نے مجھے جو پیسے دیئے ہیں ان سے گاڑی خرید لیں۔ ہم نے بڑے چاؤ سے گاڑی خریدی لیکن بعد میں جب بھی کبھی میں رخسانہ کو ستاتا تو وہ باؤنسر مارنے سے نہ چوکتی،

”رہنے دیں، آپ وہی ہیں ناں جنہوں نے ایک ہاتھ سے حق مہر دیا اور دوسرے ہاتھ سے کار خریدنے کے لئے واپس لے لیا تھا“۔

اسی دوران مارچ ۱۹۸۶ء میں راحیلہ کی شادی پر ہم لاہور گئے جہاں نہایت اہتمام سے کار کی نوک پلک ٹھیک کروائی کیونکہ یہ میری پہلی کار تھی۔ جون جولائی میں یونٹ کے راولپنڈی تبادلہ کے احکامات آ گئے اور ہم پڑاؤ ڈالنے راولپنڈی پہنچ گئے۔

☆ ☆ ☆

پنڈی سے کوئٹہ سے پنڈی

گو کہ فوج کی بیرکوں کیلئے کوچ پنڈی سے ہی کیا تھا لیکن راولپنڈی کی قدیم چھاؤنی کے بارے کوئی خاص علم نہیں تھا۔ فیملی لائف کے حوالے سے راولپنڈی کے بارے میں خاصی دل دہلا دینے والی باتیں سُن رکھی تھیں۔ مثلاً وہاں سرکاری گھر مشکل سے ہی ملتا ہے، عموماً افسران عرصہ گزار کر واپس چلے جاتے ہیں لیکن گھر نہیں ملتا۔ اور دوسرا یہ کہ پیشہ ورانہ مصروفیات اس قدر زیادہ ہوتی ہیں کہ افسر اپنے اہل خانہ کو وقت ہی نہیں دے پاتے۔ مجھے ان دونوں باتوں کا بخوبی احساس تھا۔ اور اس بارے کوئی فکر نہیں تھی۔ ہاں البتہ مجھے رخسانہ کی بیحد فکر تھی جو ہمارے آنگن میں چوتھا پھول کھلنے کی خوشخبری دے چکی تھی۔ جیسے تیسے کر کے ویسٹرتیج میں ایک گھر لیا اور اسے ریکوزیشن کروالیا۔ مجھے اس دفعہ یونٹ میں رہنے کا بہت کم موقع ملا۔ راولپنڈی پہنچنے کے چند ماہ بعد ہی ایک لمبے عرصہ کے کورس کیلئے میرا نام آ گیا اور مجھے جولائی میں اس کورس کے لئے مری جانا پڑا۔ اب ڈاکٹر، ہسپتال لانے لیجانے کے لئے کسی کو تو رخسانہ کے پاس ہونا تھا۔ امی اسلام آباد رہتی تھی سو اپنی خوشدامن، ممانی جان سے درخواست کی جو فوراً پہنچ گئیں۔ یونٹ میں بھی کہہ دیا کہ جس روز ہسپتال جانا ہو مروجہ طریقے کے مطابق پے منٹ پر گاڑی دے دیا کریں۔ مری سے تقریباً ہر ویک اینڈ پر راولپنڈی کا چکر لگ جاتا اسلئے کوئی زیادہ فکر نہیں تھی ہاں البتہ ۱۰ ستمبر ۱۹۸۶ء کو جب ہمارے ہاں چوتھے مہمان کی آمد ہوئی تو

مجھے اس کی اطلاع مری، فون پر ملی۔ شام کو میں پنڈی پہنچا اور سامان گھر رکھ کر سیدھا رخسانہ کے پاس ہسپتال گیا۔ میری رفیق سفر نے مسکرا کر میرا استقبال کیا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا،'' میری جان! ایک روز اور انتظار کر لیتیں'' اور وہ کوئی جواب دیئے بغیر مسکرا دی۔ دراصل میرا اشارہ بڑے بیٹے شہریار کی طرف تھا جس کی تاریخ پیدائش ۱۱ ستمبر تھی۔ تاہم دونوں بیٹوں کا آپس میں فرق آٹھ سال کا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ اٹھائیس سال بعد آج ہی کی تاریخ کو ایک مہیب بگولہ آئیگا جو میرے آشیانے کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائیگا؟ اس بیٹے کا نام میں نے ابو بکر سوچ رکھا تھا جبکہ ابا جان کی خواہش تھی کہ نام سرمد ہو۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ اس کا نام سرمد ابو بکر سہیل ہوگا۔ ہمارا خوبصورت سا پر رونق ہنستا کھیلتا کنبہ مکمل ہو چکا تھا۔ ہمیں اب ان بچوں کی تعلیم و تربیت اور کردار سازی پر توجہ دینی تھی۔ رخسانہ چونکہ نہایت نرم دل اور ٹوٹ کر پیار کرنے والی تھی اور میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ بچوں کو اگر کلی طور پر ماں پہ چھوڑا تو وہ اس کا ناجائز فائدہ اُٹھا سکتے تھے چنانچہ ان کی تربیت کا شعبہ میں نے اپنے ہاتھ میں ہی رکھا جبکہ پیار، محبت اور لاڈ جیسی اشیاء بچوں کو ماں کے کاؤنٹر پر دستیاب تھیں۔

دسمبر میں کورس ختم ہوا تو میرے کوئٹہ تبادلے کے احکامات موصول ہو گئے۔ پنڈی پہنچ کر جیسے تیسے سامان باندھا اور اردلی کو ٹرک کے ساتھ کوئٹہ روانہ کر دیا اور رخسانہ و بچوں کو دس دن ٹھہر کر آنے کا کہہ کر خود بھی روانہ ہو گیا۔ مقصد تھا کہ گھر کی کچھ شکل وغیرہ نکال لوں۔ کوئٹہ میں مخصوص گھر ابھی خالی نہیں ہوا تھا۔ سو مجھے کچھ روز عارضی رہائش گاہ میں گزارنے پڑے۔ چند روز بعد بیگم بچے بھی پہنچ گئے اور جلد ہی ہمیں گلستان روڈ پر مستقل رہائش گاہ بھی مل گئی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ بیگم بچوں کو کوئٹہ بہت پسند آیا۔ گو وہاں کے پہاڑ مری کے مقابلے میں سرسبز تو نہیں ہیں لیکن ان سنگلاخ اور بنجر پہاڑوں کا ایک اپنا ہی حسن ہے۔ ہاں البتہ کوئٹہ وادی سرسبز باغوں سے بھری پڑی ہے۔ حنہ، اڑک، شیلا باغ اور تھوڑے سا سے فاصلے پر زیارت۔ حیرت انگیز طور پر کوئٹہ پہنچتے ہی رخسانہ کا سانس کا مسئلہ بھی سرعت رفتاری سے بہتر ہونا شروع ہو

گیا تھا۔ بہت سے پرانے جان پہچان والوں سے بھی ملاقات ہوئی۔فوج میں تبادلوں کی یہی ایک خوبصورتی ہے کہ آپ کا اپنی جان پہچان والوں سے اکثر ایک سے زیادہ مرتبہ کسی نہ کسی اسٹیشن پر سامنا ہو ہی جاتا ہے۔ میں نے سرکاری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔اور رخسانہ نے جلد اڑوس پڑوس کی خواتین کے ساتھ ملکر حلقہء احباب قائم کرلیا۔سکھیوں کا یہ جھرمٹ روائتی انداز میں افسران کے صبح دفتر جانے کے بعد کسی ایک گھر میں صبح کی چائے کے لئے اکٹھا ہوتا جہاں حالات حاضرہ، بچوں کے معاملات، سلائی، بنائی، کڑھائی سے شروع ہو کر بات پکوان پر ختم ہوتی ۔ اور دو پہر شوہر حضرات کے دفتروں سے واپسی سے گھنٹہ ڈیڑھ قبل یہ محفل برخاست ہو جاتی۔ رخسانہ نہایت مہمان نواز اور کشادہ دل تھی اور پھر کوکنگ میں مہارت کیوجہ سے اکثر اس کالونی کا اکٹھ ہمارے ہاں ہی ہوتا۔اپنی خوبصورت عادتوں کے سبب اس نے سب کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ نادیہ پنجم، شہریار سوئم، اور جویریہ جماعت اول کی طالبہ تھی جبکہ سرمد ابھی گھٹنوں کے بل تھا۔

سرمد کی پہلی سالگرہ کے کچھ ہی عرصے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے نتیجے میں، میں نے ایسی ناراضگی کا اظہار کیا کہ چند روز ہماری بول چال بند رہی۔ غالباً نومبر یا دسمبر ۱۹۸۷ء کا مہینہ تھا سرمد کی کچھ دنوں سے طبیعت خراب تھی اور اُسے بخار کی شکایت تھی۔ مجھے ورثے میں اپنی امی سے ایک چیز ملی جو آگے بچوں میں بھی منتقل ہوئی اور وہ تھا بخار سر کو چڑھنا۔ نادیہ سے لیکر سرمد تک سب کو ہی شکایت تھی اور ہمیں خاصی فکر رہتی تھی۔ دن میں کچھ کاغذات کی ضرورت پڑی جو اتفاق سے گھر رہ گئے تھے۔ میں انہیں لینے گھر آیا تو دیکھا کہ نادیہ، سرمد کو کمبل میں لپیٹے گود میں لئے لان میں گھوم رہی تھی۔ میں نے پوچھا امی کہاں ہے تو اس نے بتایا کہ پڑوس کی کسی خاتون کے ساتھ بازار گئی ہوئی ہیں۔ میں نے گرم کپڑوں میں لپٹے سرمد کو ہاتھ لگایا تو دیکھا کہ وہ شدید بخار سے تپ رہا ہے۔ابھی میں اس کے سر سے ٹوپی اُتار ہی رہا تھا کہ سرمد نے آنکھیں موند لیں اور اس کے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ میں نے فوراً اسے گود میں اُٹھایا اور

گاڑی میں ڈال کر سی ایم ایچ بھاگا۔ سرمد بالکل ساکت اور نبض ڈوب چکی تھی۔ ہسپتال سیدھا چائلڈ سپیشلسٹ کے پاس جا کر چند لفظوں میں ساری کیفیت بیان کی۔ اس نے فوراً اسے اپنی دفتر کی میز پر ہی لٹا کر تمام کپڑے اُتار دیئے اور ایک انجکشن لگایا میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے گڑگڑا کر اس کی صحت یابی کی دعائیں کر رہا تھا۔ ایک منٹ بعد سرمد نے چیخ ماری اور وہیں میز پر اس کا پیشاب خطا ہو گیا۔ کچھ کہنے لگا تو ڈاکٹر جن کا نام مجھے یاد نہیں لیکن غالباً حافظِ قرآن تھے انہوں نے مجھے روک دیا اور بولے،

''سر! اللہ نے کرم کیا ہے اور آپ کو بیٹا لوٹا دیا ہے''۔

ہلکے کپڑوں میں لپیٹ کر انھوں نے مجھے سرمد کو گھر لے جانے کی اجازت دی۔ اور دوائیوں کے ساتھ شام کو آنے کی ہدایت بھی کی۔ اتنے میں رخسانہ کہیں گھر پہنچی تو پتہ چلا تو انہی قدموں اپنی دوست کے ساتھ ہسپتال پہنچ گئی۔ مجھے غصہ تو تھا لیکن ہسپتال سے نکل کر ظاہر کیا اور صرف اتنا کہا،

''اگر سرمد کو کچھ ہو جاتا تو تمہارے لئے میرے گھر میں کوئی جگہ نہ تھی''۔

شاید میں بہت زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ میرا غصہ عموماً پہاڑی ندی نالوں کی روانی کی طرح ہوا کرتا تھا، یہ آیا اور وہ گیا۔ تاہم یہ میری غلطی تھی۔ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ میں باپ ہوں لیکن وہ ماں ہے جو اپنی اولاد کو نو ماہ کوکھ میں رکھتی اور تمام تکلیفیں برداشت کرتی ہے لیکن اس روز نجانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے دو روز تک رخسانہ سے کلام نہ کیا۔ رخسانہ کو بھی جیسے چپ لگ گئی۔ تیسرے روز جب عشاء کی نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹے تو میرا غصہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ میں نے رخسانہ سے سخت لہجے میں بات کی۔ اس کی جگہ میں بھی تو ہو سکتا تھا؟ اگر میں باپ ہوں تو وہ بھی تو ماں ہے۔ اس کا حق تو مجھ سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے لئے تو اللہ جل و شانہ اور رسول ﷺ نے بھی نہایت واضح احکامات دیئے ہیں۔ جوں جوں سوچتا گیا شرمندگی بڑھتی گئی۔ رخسانہ کی طرف دیکھا تو وہ دوسری جانب

کروٹ لئے لیٹی تھی۔ مجھے علم تھا کہ وہ سو نہیں رہی۔شادی کے بارہ سالوں بعد ہم ایک دوسرے کو بخوبی جاننے لگے تھے۔میں نے آہستہ سے کندھا ہلا کر کہا،

''رخسانہ! سوگئی ہو کیا''؟

اس نے منہ موڑے بغیر ہی جواب دیا،''نہیں جاگ رہی ہوں''۔

میں نے کہا،''منہ میری طرف کرو''۔

اس نے منہ میری طرف کیا اور میرے منہ سے صرف اتنا نکلا،''سوری، مجھے معاف کردو۔ مجھے وہ سب کچھ نہیں کہنا چاہئے تھا''۔

''کوئی بات نہیں، میری بھی تو غلطی تھی۔ مجھے نہیں جانا چاہیے تھا'' اس نے بس اتنا کہا۔ بیڈروم کی دھندلکی روشنی میں مجھے اس کی آنکھوں میں چمکتے آنسو صاف نظر آرہے تھے۔ سرمد ہمارے درمیان لیٹا ہوا تھا ہماری باتوں سے وہ مخل ہوا اور نعرہ مار دیا۔ہم دونوں کی ہنسی نکل گئی۔ ہماری صلح ہو چکی تھی، جی ہاں وہ صلح جس کا ہر جھڑپ کے بعد ہمیں بے صبری سے انتظار ہوا کرتا تھا۔

کوئٹہ کے سکولوں میں گرما میں صرف پندرہ روز کی چھٹیاں ہوتی تھیں جبکہ بچوں کو لمبی تعطیلات موسم سرما میں ہوا کرتی تھیں۔ان تعطیلات کے دوران رخسانہ بچوں لیکر لاہور نکل جایا کرتی تھی جہاں تقریباً ایک ماہ رہنے کے بعد وہ اسلام آباد چلی جایا کرتی جبکہ میں بعد میں چند دنوں کی چھٹی لیکر ان لوگوں سے جاملتا تھا، اسی دوران ہم دونوں کو بیکنگ کرنے اور کیک بنانے کی سوجھی۔روبی اور عثمان بھائی ایک ایسی فیملی تھی جس سے ہمارے دیرینہ خاندانی تعلقات ہیں۔ان لوگوں کی ان دنوں سٹاف کالج میں تعیناتی تھی۔ دونوں میاں بیوی کیک بنانے میں بیحد ماہر سوان سے ترغیب پاکر ہم لوگ بھی لاہور سے کیک بنانے کا سامان لیکر گئے۔دیکھتے ہی دیکھتے خاصی مہارت حاصل کرلی۔کیک بھی کوئی چھوٹے نہیں بلکہ چار چار پانچ پانچ پاؤنڈ کے بڑے تقریبات والے کیک مختلف ذائقوں کے ساتھ۔رخسانہ کیک بناتی اور انکی سجاوٹ کا

کام میرے ذمہ ہوتا۔ ایک وقت تو ایسا آیا کہ ہمارے بچے اگر ملنے جلنے والوں کے بچوں کی سالگرہ پر جاتے تو ان کی فرمائش ہوتی کہ کیک بنا کر بھجوائیں۔ ہم فرمائش کو ٹال بھی نہیں سکتے تھے لیکن آپس میں ہنستے کہ اگر یہی رفتار رہی تو ہم جلد دیوالیہ ہو جائیں گے اور دوستوں کے علاوہ ابا جی کے دوست سید ضمیر جعفری کے فرزند اور میرے نہایت پیارے دوست احتشام ضمیر اور روبی بھی کوئٹہ ہی میں تھے۔ ان کے ساتھ بھی خوبصورت وقت گزرا۔

ہمارا کوئٹہ کا دور خاصا یادگار اور ناقابلِ فراموش ہے۔ ہمارے بزرگ و دیگر اہلخانہ، عزیز و اقارب اور دوست احباب پاکستان کے ہر کونے سے ہمارے پاس آتے اور خوب رونق رہتی۔ جو شاید زندگی میں کبھی کوئٹہ نہ دیکھ پاتے، محض ہمارے کوئٹہ میں ہونے کی وجہ سے انہوں نے زیارت کا خوبصورت مقام بھی دیکھ لیا جہاں ہماری قائداعظم کے آخری ایام کے خدمتگار ملک طوطی خان مرحوم سے بھی ملاقات ہوئی جن کے ساتھ میری اور بچوں کی تصویریں بھی ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں امی جی اور ابا جان میرے پاس چند روز کے لئے آئے۔ ریڈیو، ٹی وی والوں کو بھنک پڑی تو انہوں نے آن لیا۔ مختلف پروگرام ریکارڈ کئے، مشاعرے ہوئے اور شامیں منعقد کی گئیں۔ ابا جان بیحد خوش تھے اور زیادہ خوشی انہیں اس بات کی تھی کہ ان کی بہو نے نہ صرف گھر خوبصورت اور مانندِ جنت رکھا ہوا تھا بلکہ اس نے بزرگوں کی مہمان نوازی اور خدمت میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ابا جی بھی رخسانہ سے بیحد شفقت فرماتے تھے۔ کوئٹہ میں ہی ادب پسند دوستوں سے خوب نشستیں ہوئیں۔ مرحوم عطا شاد، رفیق قریشی صاحب سے خوب گپ شپ رہتی۔ ٹی وی پر سجاد احمد، جمال شاہ، طارق معراج، نسیم طارق اور مصطفیٰ مندوخیل سے دوستی کی بنیاد پڑی۔ دیکھتے دیکھتے کوئٹہ میں تین سال گزر گئے اور سرکار نے ایک بار پھر یونٹ پہنچنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ بچوں کی ضد تھی کہ سفر اس مرتبہ جہاز کے بجائے ٹرین سے کریں گے۔ خود رخسانہ کی بھی یہی خواہش تھی سو پاکستان ریلوے کو زحمت دینے کا فیصلہ ہوا۔ اب تک میری خاصی نوکری ہو چکی تھی اور سی او کے بعد یونٹ کے سینئر افسران میں شمار ہوتا تھا۔

کل ہم خودنو جوان لفٹین تھے اور ہمارے سینئر ہمیں اپنے بچوں کی طرح سمجھتے اور ہمارا خیال رکھتے تھے۔آج ہمارے جونیئر ہم سے یہی توقع رکھتے تھے۔یونٹ میں اور بھی سینئر تھے لیکن نو جوان افسران کا جولگاؤ ہم دونوں سے تھا وہ شاید ہی کسی اور افسر کی فیملی سے ہو۔وہ ڈانٹ جو دفتری اوقات میں وہ مجھ سے کھایا کرتے تھے آفس ٹائم کے بعد رخسانہ اس کا مداوا کر دیا کرتی تھی۔رخسانہ سب کے لئے ماں کا درجہ رکھتی تھی اور وہ اسے آپا کہا کرتے تھے حالانکہ فورسز میں ایک عجیب رسم ہے کہ بیس برس کا لفٹین خواہ وہ جنرل کے بیٹے کا ہم عمر ہی کیوں نہ ہو لیکن سنئیر کی اہلیہ کو بھابھی ہی کہے گا۔اسی طرح سینئر افسران کی بیگمات بھی جونیئر افسران کو بھائی کہہ کر ہی بلائیں گی مگر ہم دونوں نے اس رسم سے بغاوت کی۔رخسانہ سب بچوں کے نام لے کر اور بیٹا کہہ کر بلاتی اور جن کی بعد میں شادیاں ہوئی، میں ان کی بیگمات کے نام لے کر اور بیٹا کہہ کر بلاتا۔بہت سے ایسے ہیں جن کا اب تک مجھ سے رابطہ ہے اور مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہیں۔یہ وہ بچے ہیں جو اب کرنل، بریگیڈیئر بن کر ریٹائر بھی ہو چکے ہیں لیکن وہ اب بھی اسی ادب،احترام اور پیار سے ملتے ہیں۔یہ ہمارے خاندان کا حصہ تھے اور ہیں ان میں ثاقب سعید اور انیلا،راشد محسن اور سیما،ساحر حجاز اور شیبا،وسیم بیگ اور ارم،اظہر عالم اور سروش تو وہ تھے جو براہ راست میرے ساتھ رہے لیکن چند ایک ایسے بھی تھے جو میرے بعد یونٹ میں آئے لیکن انہی کی وجہ سے مجھے ملے اور اب تک اسی محبت سے ملتے ہیں وہ ہیں جواد جہاں اور نورین۔ان سب کا جب میس میں کھانوں سے دل اچاٹ ہوتا تو اپنی آپا کو پیغام بھیجتے کہ فلاں رات کھانا گھر پر کھائیں گے۔مزے کی بات یہ ہے کہ چٹ میں مینو بھیجنا نہ بھولتے اور مجھے اکثر ایسی ناگہانی دعوتوں کا رخسانہ سے پتہ چلتا۔

مجھے پنڈی پہنچے سال بھی نہ ہوا تھا کہ پلٹن کے بلوچستان روانگی کے احکامات آ گئے۔ ہم لوگوں نے تو آگے چمن میں ہونا تھا۔لیکن فیملیوں کو کوئٹہ میں گھر ملنے تھے۔بچوں اور رخسانہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا تاہم اس دفعہ کوئٹہ کا عرصہ گذشتہ کے برعکس، بھرپور نہ گزرا۔میں کبھی

بچوں کو بلالیتا اور کبھی چھٹی پر کوئٹہ آجاتا۔ اسی دوران اچانک ایک روز آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل میجر جنرل ریاض اللہ مرحوم کا مجھے فون آیا کہ محکمہ کو میری ضرورت ہے میں ان کے ماتحت کشمیر میں نوکری کر چکا تھا اور وہ میرے خاندانی ادبی پس منظر اور لکھنے پڑھنے کے شغف سے بخوبی واقف تھے۔ بدقسمتی سے یونٹ کے اسوقت کے کمانڈنگ آفیسر صاحب کچھ احساس کمتری کے مارے ہوئے تھے اور میری ان سے کوئی خاص نہیں بنتی تھی سو میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے فوراً ہامی بھر لی۔ اگلے روز بذریعہ سگنل میرا پوسٹنگ آرڈر آ گیا۔ مجھے فوری طور پر رپورٹ کرنا تھی۔ کچھ نہ پوچھئے کیا حال تھا۔ ابھی بمشکل سامان کھولا ہی تھا اور مجھے یونٹ میں آئے سال بھی نہ ہوا تھا کہ پھر ہجرت۔ جیسے تیسے کر کے رخت سفر باندھا اور عازم راولپنڈی ہوئے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ رخسانہ کسی پوسٹنگ پر خوش ہونے کے بجائے بوجھل اور اداس تھی۔

راولپنڈی پہنچ کر ایک مرتبہ پھر گھر کی تلاش بچوں کے سکول کے داخلے اور باقی معاملات کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ تاہم ابا جی کا گھر اسلام آباد میں ہونے کی وجہ سے کچھ سہارا رہا۔ بڑے بچے بالترتیب نویں، ساتویں اور پانچویں میں تھے۔ جبکہ چھوٹا سرمد ابھی سکول نہیں جا رہا تھا۔ یہ پوسٹنگ ایک لحاظ سے آخری پوسٹنگ ثابت ہوئی کیونکہ اس کے بعد آئی ایس پی آر میں ملازمت کے دوران ہی میں نے استعفیٰ دے کر رخصت لے لی اور اسکی وجہ محض میری ترقی نہ ہونا تھی جس میں میرے ایک محترم کمانڈنگ آفیسر کی مہربانی کو بہت دخل تھا۔ مجھے کوئی گلہ نہ تھا کیونکہ میں اسے اللہ کی رضا سمجھ کر صابر و شاکر تھا لیکن رخسانہ نے اس کا بیحد صدمہ لیا۔ اس کی دانست میں جب میں ایک اچھا ڈسپلن کا پابند اور قابل افسر تھا تو ساری رپورٹوں کو ایک طرف رکھ کر صرف آخری رپورٹ کو ہی کیوں اہمیت دی گئی اور پھر اس رپورٹ کا اگر وہ اسقدر اہم تھی تو نتھارا کیوں نہیں کیا گیا؟ اب میں اس معصوم اور سادہ لوح ہمسفر کو کیسے سمجھاتا کہ فوج میں کیا دیکھا جاتا ہے اور کیا نہیں دیکھا جاتا۔

جس روز پروموشن بورڈ کا اعلان ہوا مجھے پروموشن نہ ہونے کا کوئی دکھ نہ ہوا لیکن رخسانہ کی آنکھوں میں تیرتے آنسو میرا جگر چیر رہے تھے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ اگر پروموشن ہوئی تو اُسے ڈرائینگ روم کا نیا فرنیچر بنوا کر دوں گا۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اُسے شام کو ساتھ لے کر گیا اسے اسکی پسند کا فرنیچر دلوایا اور بچوں کو باہر کھانا کھلایا۔ مجھے دکھ ہے کہ میں رخسانہ کو وہ خوشی نہ دے سکا جس کا اُسے ہی نہیں بلکہ ترقی کے زینے پر موجود ہر افسر کی شریکِ حیات کو ہوتا ہے۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ جس ناانصافی پر مجھے صدمے کا اظہار کرنا چاہیے تھا اس دُکھ کو اس نے دل سے لگایا اور اکثر اُٹھتے بیٹھتے وہ اس کا اظہار بھی کیا کرتی تھی۔

پروموشن بورڈ میں نظر انداز کئے جانے کے ڈیڑھ سال بعد ہی ہمیں ایک عظیم سانحے سے اسوقت دو چار ہونا پڑا جب میرے پیارے ابا جی، میرے دوست، میرے اتالیق مشہور شاعر ادیب اور دانشور الطاف پرؔواز دائی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ ہماری زندگیوں میں ایک بہت بڑا خلاءً پیدا ہو چکا تھا۔ اگر امی ہمارے لئے گھر کی دیواروں کی حیثیت رکھتی تھیں تو ابا جی کی حیثیت گھر کی چھت کی سی تھی جو ہمیں موسموں کی شدت سے پناہ دیتی تھی۔ ابا جی کی رحلت کے بعد ایسا لگا کہ جیسے ہم بنا چھت کے چھپر میں مقیم تھے جہاں امی کی باہوں کے حصار کی دیواریں ہم بہن بھائیوں کو طوفان سے پناہ تو دیتی تھیں لیکن ہم سب بارش میں بہت بھیگتے تھے۔ لیکن یہ سب ہمارا نصیب تھا اور ہمیں اب دیواروں کے کھنڈر میں ہی امان تلاش کرنا تھی۔

فوج میں ایک ضابطہ ہے کہ اگر میجر کے عہدے کے کسی آفیسر کی ملازمت ہر لحاظ سے بے داغ رہی ہو، وہ ایماندار ہو، جانفشانی سے کام کرتا رہا ہو لیکن کسی تکنیکی وجہ سے یا سالانہ کارکردگی کی رپورٹیں نرم ہونے کی وجہ سے کرنل کے عہدے پر ترقی نہ پا سکے تو پہلی دفعہ نظر انداز کئے جانے کے چار سال بعد ایسے آفیسر کو ترغیبی ترقی (Incentive Promotion) دے دی جاتی ہے۔ میرا نظریہء اس معاملے میں مختلف تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ جب ایک آفیسر کو تمام تر جانفشانی اور ایمانداری کے بعد بھی ترقی نہیں ملتی تو یہ اس کی قسمت ہے لیکن اسے ریٹائرمنٹ

پر محض مفادات کے لئے ملنے والی یہ ترقی ہرگز قبول نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے رخسانہ کو اپنا نقطۂ نظر سمجھا کر اس کی خواہش پوچھی کہ کیا وہ چاہتی ہے کہ میں اس ترقی کا انتظار کروں اور وہ رینک کندھے پر سجاؤں جن کا اُسے شدت سے انتظار تھا؟ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میری رفیق زندگی نے میرے نقطۂ نظر کی بھرپور حمایت کی چنانچہ ترغیبی ترقی سے ایک سال قبل ہی میں نے فوج سے ریٹائرمنٹ حاصل کر لی۔ جس کے ساتھ ہی مجھے ایک سال کی چھٹی بمعہ تنخواہ و مراعات مل گئیں اور یوں میں نے جنوری ۱۹۹۴ء میں فوجی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ یہ ریٹائرمنٹ میری زندگی کا اہم موڑ تھا۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں اب تک کٹھن اور دشوار راستہ طے کر کے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچا تھا جہاں پہنچ کر علم ہوا کہ چوٹی میری منزل نہیں اور ابھی مجھے مزید سفر طے کرنا ہے لیکن اتفاق سے اگلا سفر نشیب کا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک سال کی چھٹی لینے کا مشورہ بھی میری رفیقہ حیات کا تھا اور اس کے پیش نظر گھر کی سہولت تھی جو ہم ایک سال دو ماہ تک رکھ سکتے تھے۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وقت آنے پر اس کا یہ مشورہ صحیح ثابت ہوا۔ ایک سال کیلئے چھت اور رسوئی کی فکر سے بے نیاز ہو کر میں اپنے مستقبل کے بارے بہتر فیصلہ کر سکتا تھا۔ میں ذاتی حیثیت میں تو اب قید و بند سے آزاد شخص تھا لیکن کنبے کے حوالے سے بھاری اور سنگین آزمائشوں کا سامنا کرنے جا رہا تھا۔ میرے تن پر اب وردی نہیں بلکہ سول کپڑے تھے۔

آزمائشیں اور بحران

فوجی بیرکوں سے نکلتے ہی سر میں کاروبار کا بھوت سمایا جس کے لئے میں ایک عرصہ سے پر تول رہا تھا۔ گھونسلے میں بیٹھے چڑیا کے بچے کو باہر کی دُنیا جنت نظر آتی ہے اور یہی حال کچھ میرا تھا خیال یہی تھا کہ ادھر کچھ کروں گا اور ادھر ہُن برسنا شروع ہو جائیگا۔ سال کی چھٹی کے دوران ایک آدھ جگہ ملازمت کی تو سول اور فوج کی ملازمت میں واضح فرق کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی جلد ہی قائل ہونا پڑا کہ اگر ملازمت ہی کرنا تھی تو فوج کی ملازمت سے بہتر کوئی ملازمت نہ تھی۔ سال کی چھٹی ختم ہوئی، پنشن ملی تو سب سے پہلے گھر تبدیل کیا۔ بہت سی ایسی مراعات تھیں جواب ہمیں داغ مفارقت دے چکی تھیں۔ اور رخسانہ نے ان کو شدت سے محسوس کیا تھا۔ اب اسے رسوئی اور گھر کی صفائی کو زیادہ ٹائم دینا پڑ رہا تھا۔

رخسانہ کی خواہش تھی کہ عمرہ کرے۔ میں چند سال پہلے امی اور ابا جی کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کر چکا تھا۔ سو مجھے اس کی خواہش کا شدت سے احساس تھا۔ جب یکمشت پنشن ملی تو میں نے اُسے دو چیزوں کے لئے دعوت دی؛ اول تو یہ کہ وہ میرے ساتھ عمرہ پہ چلے اور اس کی خواہش پوری ہو اور دوسرا کہ اپنا کچھ زیور بنوا لے۔ حیرت انگیز طور پر اس نے یہ دونوں دعوتیں قبول کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ لیکن اس میں بھی اس کا پیار پنہاں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ زیور کی تو اتنی خواہش نہیں رکھتی ہاں البتہ جب میرا کاروبار چلے گا تو ان شاء اللہ

دونوں حج کرنے چلیں گے۔

میں نے ایک دو کاموں میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔ اور کام بھی ایسے کہ کوئی انگوٹھا چھاپ بھی شروع کرتا تو رزق کی ریل پیل ہوتی لیکن ہمیشہ کی طرح میری قسمت نے یہاں بھی وفا نہ کی۔ آزمائشوں نے چاروں طرف سے ہلہ بول رکھا تھا۔ اس دوران بڑی بیٹی نادیہ کے لئے پیغامات آنے شروع ہوگئے۔ اور ہم نے ایک اچھا رشتہ دیکھ کر ہاں کر دی۔ جاوید کی رہائش فیصل آباد کی تھی۔ اور وہ کاروباری طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ نہایت سلجھا ہوا خوبصورت وخوب سیرت کا مالک، بن ماں باپ کا یہ بچہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور سب کی آنکھ کا تارا تھا۔ رُخسانہ چاہ رہی تھی کہ ہم فوراً ہاں کہہ دیں۔ لیکن اُسے یہ بھی علم تھا کہ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ میں بچوں کی تربیت کے معاملے میں ہمیشہ سخت گیر رہا ہوں لیکن ان کے بنیادی اور شرعی حقوق کے بارے میں جبر کا کبھی بھی قائل نہیں رہا۔ مجھے پتہ تھا کہ میری بیٹی اپنی عمر کی دوسری لڑکیوں کیطرح ایک فوجی آفیسر کے خواب دیکھا کرتی تھی اور میرے لئے ضروری تھا کہ اس کی مرضی جانے بغیر میں ہاں نہ کروں۔ لڑکے والے چند تصویریں دے گئے تھے۔ ایک روز میں نے نادیہ کو پاس بٹھا کر اونچ نیچ سمجھا کر تصاویر اس کے حوالے کر دیں اور کہا کہ وہ اپنی ماں، بہن اور دوستوں سے مشورہ کرے۔ اسے اختیار ہے کہ ہاں کرے یا ناں۔ اگر اسے یہ رشتہ ناپسند ہوا تو دو دن بعد تصویریں صبح کالج جاتے ہوئے خاموشی سے میرے سرہانے کے نیچے رکھ دے لیکن اگر اسے پسند آئے تو تصویریں پاس ہی رکھے میں سمجھ جاؤں گا۔ نادیہ نے دو دن بعد بھی تصویریں نہ رکھیں تو میں نے لڑکے والوں کو ہاں کر دی۔

اس کے ساتھ ہی رخسانہ کی پریشانی اور تفکرات میں اضافہ ہوتا چلا گیا کہ میرا تو کام ڈانواں ڈول چل رہا تھا پھر یہ سب کیسے ہونا تھا؟ میں نے تسلی دی کہ رب العزت بہت رحیم و کریم اور بڑا کارساز ہے وہ اپنی مخلوق کو کبھی بھی بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ میں نے اپنے ایک دو چھوٹے موٹے کاموں کو بند کر کے ان سے پیسہ نچوڑا اور بھی کونوں کھدروں سے جو نکل سکتا تھا

نکالا لیکن میں اپنے ساس سسر (ماموں اور ممانی) کا احسان کبھی نہیں بھول سکتا جو اس امتحان کے وقت میرے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے ہو گئے تھے اور یوں نہایت باوقار طریقے سے ہم نے بیٹی کو رخصت کر دیا۔

دوسری جانب میرے کاروبار کی بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی اور وہ نہایت سرعت سے زوال پذیر تھا۔ اور پھر بالآخر وہ دن آ گیا جب مجھے ماننا پڑا کہ مجھے کاروبار میں شدید دھچکا لگ چکا تھا۔ میں بیس بائیس لاکھ صرف مقدر کھوٹا ہونے کے باعث ڈبو چکا تھا لیکن میرا ضمیر مطمئن تھا کیونکہ میں نے یہ پیسہ غلط کاموں، عیاشی اور اللّوں تلّلوں میں ضائع نہیں کیا تھا بلکہ اچھے دنوں کی تلاش میں بہہ گیا تھا۔ میں کرائے کے مکان میں رہ رہا تھا اور میرے پاس کوئی ملازمت بھی نہ تھی۔ لیکن میرے مالک نے میرا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے رخسانہ کی صورت میں ایک فرشتہ عطا کیا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ اس کٹھن وقت کے دوران کبھی رخسانہ نے کوئی گلہ کیا ہو۔

رخسانہ ذاتی حوالے سے نہایت مطمئن، قناعت پسند اور درویشانہ طبیعت کی مالک تھی تاہم گھریلو معاملات، بچوں کی پرورش اور دنیاداری کے حوالے سے اس مالی دھچکے کے بعد وہ خاصی متفکر اور بجھی بجھی رہنے لگی تھی ہاں یہ الگ بات ہے کہ اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن میں اس کی طبیعت کی تلخی کو اب محسوس کرنے لگا تھا۔ رخسانہ کی طبیعت کی شوخی اور چنچل پن اب ایک نہایت خفیف انداز میں معدوم ہوتا جا رہا تھا لیکن آفرین ہے اس پر کہ اس نے گھریلو معاملات کو میری معاشی استطاعت کے حوالے سے سکیڑنا شروع کر دیا تھا۔ میں اپنی رفیق زندگی کا حتیٰ الوسع دل لبھانے کی کوشش کرتا اور وہ میری باتوں اور حرکتوں سے محظوظ بھی ہوتی مگر میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ اس کی روزمرہ زندگی کی چمک پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ کبھی مجھے کہیں سے کوئی لکھنے لکھانے کا کام ملتا اور چند پیسے ہاتھ آتے تو میں سب سے پہلے رخسانہ کو خوش کرنے کی کوشش کرتا اور اس معصوم عورت کو خوش کرنا بہت آسان تھا۔ بس گھر کے

استعمال کی کوئی چیزیں مثلاً برتن، کراکری وغیرہ لے آیا، کوئی فرنیچر، قالین خرید لیا تو چھاناں کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ اور اگر کبھی کہیں اُسے ساتھ لے جا کر شاپنگ کر لی جاتی تو سمجھئے جیسے اسے دنیا بھر کی دولت مل گئی ہو۔ بچے اکثر مذاق میں کہا کرتے تھے کہ امی مہینے کی پہلی تاریخوں میں بے حد خوش ہوتی ہیں اور وجہ بیان کرتے کہ گھر میں مہینے کا سودا سلف ڈالنے کے بعد وہ بیحد اطمینان محسوس کرتی تھی۔ اسے قسطوں میں سودا لانا ہرگز پسند نہ تھا۔ کہا کرتی تھی کہ رزق سے برکت اُڑ جاتی ہے۔ اکثر مہینے کے اختتام پر سودا سلف والی الماری کا جائزہ لیتی اور بچ جانے والی اشیا کو ذہن میں رکھ کر اگلے مہینے کے سودے کی فہرست تیار کرتی۔ اس کی ایک اور بہت بڑی خوبی گھر آئے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنا تھی۔ بھلے جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو لیکن مہمانداری میں کوئی کسر نہ رہنے دیتی۔ چونکہ میری اپنی بھی یہی عادت تھی چنانچہ اسے اس معاملے میں کبھی کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ لیکن اس کا یہ نقصان ہوتا کہ ملنے جلنے والے یا عزیز و اقارب جنھیں میرے مالی حالات کا علم تھا اکثر غلط فہمی کا شکار ہو جایا کرتے۔ میرے رب کریم نے ہمیشہ ہمارا پردہ رکھا اور کبھی خفت کا شکار نہ ہونے دیا۔ ہماری انتالیس سالہ رفاقت میں الحمدللہ مہمان نوازی ہماری شناخت رہی۔

اسی دوران ۱۹۹۷ء دسمبر میں اللہ نے نادیہ اور جاوید کو ایک چاند سا بیٹا عطا کیا۔ دونوں خاندانوں کے احباب نے نام رکھنے کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ میں چیچن مجاہد اور رہنما امام شمآل کی سوانح حیات سے بیحد متاثر تھا سو نومولود کا نام شمعل (یا شامل) بشیر رکھا۔ نانی بننے پر رخسانہ پھولے نہیں سما رہی تھی خصوصاً جب کوئی اسے جوان نانی کہتا تو اسکے چہرے کی دمک قابلِ دید ہوتی۔ شمآل ہمیشہ نانی کی آنکھ کا تارا رہا۔ وہ اسے بے تحاشا پیار کرتی اور اسکے بیجا لاڈ دیکھتی کیونکہ شمعل ہماری مستقبل کی نسل کا پہلا بچہ تھا۔

معاشی مسائل دن بہ دن بڑھتے جا رہے تھے اور میری کوشش تھی کہ مجھے جلد از جلد کوئی معقول ملازمت مل جائے۔ ملازمتوں کے حصول کے حوالے سے راولپنڈی رفتہ رفتہ

پس پردہ جا رہا تھا۔ کیونکہ تمام نجی و سرکاری دفاتر نوے فیصد سے زیادہ کی تعداد میں اسلام آباد منتقل ہو چکے تھے۔ ۱۹۹۸ء میں کچھ دوستوں کی مہربانی سے مجھے اسلام آباد میں ایک این جی او میں معقول مشاہرے پر ملازمت مل گئی مگر اب ایک اور مسئلہ درپیش تھا اور وہ تھا روزانہ اسلام آباد آنا جانا۔ خدشہ تھا کہ اگر میں نے یہی معمول رکھا تو ساری تنخواہ گاڑی کے پٹرول میں اُڑ سکتی تھی۔ دوسری جانب اسلام آباد میں گھروں کے کرائے آسمان کو چھو رہے تھے۔ اور ویسے بھی دارالحکومت مہنگائی کے حوالے سے خاصا بدنام تھا۔ اسی دوران ۲۰۰۰ء میں میری طرح رخسانہ کو بھی شفقتِ پدری سے محروم ہونا پڑا۔ ملک ریاض مختصری علالت کے بعد دنیا سے منہ موڑ گئے۔ انکی موت کا خاندان میں سب نے بیحد اثر لیا۔ خود ہر رشتہ سے ٹوٹ کر محبت کرنے والی رخسانہ کیلئے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ رخسانہ کو اپنے والد سے شدید محبت تھی اور اس نے انکی موت کو دل سے لگایا۔ اس صدمے سے رخسانہ کی سانس کی تکلیف ایکبار پھر عود کر آئی۔ اسکے بعد سے ہی اس خاندان کی رونقیں اجڑنا شروع ہو گئیں۔ اسلامیہ پارک والا گھر جہاں کبھی قہقہے گونجا کرتے تھے، زندگی قلانچیں بھرا کرتی تھی، اب وہاں مہیب خاموشی اور اداسیوں نے ڈیرے ڈال لئے تھے۔

ان حالات میں دو سال تک راولپنڈی اور اسلام آباد کے درمیان روزانہ کی بھاگ دوڑ کے بعد آخرکار اسلام آباد کو ہجرت اختیار کی۔ یہاں یکے بعد دیگر دو نوکریاں تبدیل کیں۔ دوسری نوکری جو ایک بین الاقوامی کمپنی کی تھی نائن الیون کے حادثے کی بھینٹ چڑھ گئی۔ نو گیارہ کے ڈرامے کے بعد دنیا بھر میں ایک مہیب معاشی طوفان اٹھا تھا جس نے لاکھوں لوگوں کے روزگار کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر بے روزگار اور رخسانہ ایک بار پھر پریشان تھی۔ لیکن اب میں نے عہد کیا کہ بجائے نوکری کرنے کے خاندانی پیشے یعنی ادب و صحافت میں طبع آزمائی کروں گا۔ یہ ایک کٹھن اور صبر طلب کام تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ہم سب نے ایک بات خصوصی طور پر نوٹ کی کہ رخسانہ کا ضبط اور برداشت اب کبھی کبھار

جواب دیدیا کرتے تھے اور میں اس پر خاصا متفکر تھا کیونکہ مجھے علم تھا کہ اس کی وجہ رخسانہ کی دن بہ دن بگڑتی ہوئی صحت ہے۔ بظاہر ایسا کوئی مسئلہ نظر نہیں آتا تھا لیکن جیون ساتھی ایک ایسا رشتہ ہے جو ایک دوسرے کے مزاج میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان کی وجوہات کو بنا کہے بھانپ لیتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ بھی تھا۔ میں رخسانہ کو خوش رکھنے کے لئے زیادہ چھیڑ چھاڑ کیا کرتا لیکن اس کے جوابی حملوں میں زندگی کی چمک اور حرارت کے بجائے اداسی اور مایوسی زیادہ ہوتی جو مجھے پریشان کر دیتی۔ اسے ایک مشغلہ کے طور پر فلم دیکھنے کا بہت شوق ہوا کرتا تھا۔ جو سینما سے رفتہ رفتہ ٹی وی پر منتقل ہوگیا۔ بہت تپاک سے کسی نئی یا پرانی فلم کی فرمائش کرتی لیکن مشہور تھا کہ رخسانہ نیند کے حصول کے لئے فلم منگواتی ہے۔

مجھے وہ دلچسپ واقعہ کبھی نہیں بھولے گا، جو مجھے اس وقت نہایت غیر اہم اور وقتی مذاق لگا، جب حسبِ معمول اس نے فرمائش کر کے ایک فلم منگوائی اور ہم دونوں اپنی خوابگاہ میں وی سی آر پر وہ فلم دیکھ رہے تھے غالباً دس منٹ کی فلم گزری ہوگی کہ مجھے اپنے کندھے پر رخسانہ کا سر ٹکا محسوس ہوا۔ سر گھما کر دیکھا تو وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے اس کا سر اپنے کندھے سے آہستگی سے ہٹایا اور تکیے پر رکھ کر بولا،

''بھئی یہ بہت زیادتی ہے، اُٹھو فلم دیکھو''

اس نے غنودگی میں جواب دیا کہ نیند آ رہی ہے۔ مجھے سنجیدہ شرارت سوجھی اور میں نے بات کو بڑھایا،

''دیکھو تم نے یہ وطیرہ پکڑ لیا ہے کہ فلم منگواتی ہو اور پھر فوراً سو جاتی ہو جو مجھے قبول نہیں''۔

اس نے حسبِ توقع جواب دیا کہ جب اُٹھے گی تو دیکھ لے گی۔ اب میں نے یہاں ترپ کا پتہ پھینکا جو شرارت کا آغاز تھا اور کہا کہ اس کا اگر یہی رویہ رہا تو میں دوسری شادی کرلوں گا۔ اس نے بھی جواباً مایوس نہ کیا اور کہا کہ شوق سے کرلوں۔ میرا اگلا وار تھا مجھے تحریر لکھ

دوا اور وہ ادھ کھلی آنکھوں سے بولی کہ میں خود لکھ لوں۔ میں نے تشویش کا اظہار کیا کہ اسکے دستخط ضروری ہیں۔ اور اس کا جواب تھا کہ میں لکھ کہ لے آؤں وہ دستخط کر دیگی۔ شرارت اب بہت سنجیدہ ہو چکی تھی۔ اور میں اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مجھے دل ہی دل میں اس پر بے حد پیار آ رہا تھا۔ بچوں کی ایک کاپی پکڑی اور اس پر یہ تحریر لکھ کر رخسانہ کے آگے کر دی۔

''میں رخسانہ سہیل منکوحہ سہیل پرواز اپنے شوہر کو بہ رضا و رغبت دوسرے نکاح کی اجازت دیتی ہوں۔ اور حلفاً کہتی ہوں کہ مجھے ان کے نکاح پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں یہ بیان بقائمی حوش و حواس لکھ کر دے رہی ہوں''۔

میں نے کاپی رخسانہ کے آگے سرکا دی اور اس اللہ کی بندی نے لیٹے لیٹے نیم وا آنکھوں سے بغیر پڑھے دستخط اور تاریخ درج کر دیئے۔ مجھے اس وقت اس پر بے اختیار اور بے انتہا پیار آیا اور شرمندگی بھی ہوئی کہ میں نے بھلا اس سے یہ کس قسم کا مذاق کر ڈالا لیکن کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ نہیں یہ مذاق نہیں رہا تھا بلکہ مجھ پر رُخسانہ کے اعتماد اور محبت کا تحریری ثبوت تھا جو بہت کم خواتین اپنے رفیق حیات پر کرتی ہیں۔ میں نے وارفتگی میں محوِ خواب رخسانہ کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور فلم دیکھنے میں محو ہو گیا۔ عرصہ دراز تک جب عزیز و اقارب اور دوست احباب کو اس مذاق کے بارے میں بتایا جاتا تو حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ اور خاص طور پر خواتین کا رخسانہ سے روائتی سوال ہوتا کہ اس نے کیسے نہایت آرام سے مجھے اپنی بربادی کے پروانے پر دستخط کر کے دے ڈالے جبکہ وہ تو کبھی خواب میں بھی اس بات کا نہ سوچیں؟ اس کا ایک ہی جواب ہوتا کہ آپ لوگوں کو اپنے شوہروں پر اعتماد نہیں ہوگا مگر مجھے سہیل پر اندھا اعتماد ہے کہ یہ کہیں نہیں جائینگے۔ وہ کاغذ کا ٹکڑا آج بھی میرے کاغذات کے پلندوں میں کہیں منہ چھپائے پڑا ہے۔ نہ مجھے اس کاغذ کو ڈھونڈنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ ہی میں نے کبھی کوشش کی۔

رخسانہ کا یہ اعتماد محض مجھ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اُسے ہر رشتے اور تعلق پر اندھے

اعتماد کی عادت تھی۔ خواہ وہ بچے ہوں، بہن بھائی ہوں، عزیز و اقارب ہوں یا پھر ملازم۔ میری طبیعت اس معاملے میں اس سے یکسر مختلف تھی۔ میں خدا خوفی کو بھی ملحوظ رکھتا تھا اور عزیز و اقارب سے محبت کو بھی لیکن ہمیشہ حد کے اندر رہ کر جبکہ میری رفیقہ حیات اس معاملے میں بیکراں وسعتوں کی مالک تھی۔ مجھے کسی رشتہ یا تعلق سے شکایت ہوتی تو یہ اٹل حقیقت تھی کہ رخسانہ کی ہمدردیاں ہمیشہ میرے مخالف کے ساتھ ہوتیں، خواہ وہ بچے ہوتے یا کوئی اور رشتہ دار یا پھر ملازم۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچے بغیر دوسری پارٹی کی اندھا دھند وکالت کیا کرتی۔ جب تک مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی میں اس کی اسی عادت سے خاصی چڑ کھایا کرتا تھا لیکن جب میں حقیقت کی تہہ تک پہنچا کہ اس کی وجہ رخسانہ کا رقیق القلب ہونا تھا تو پھر میں نے ایسے واقعات سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔ اسے تنگ کرنے کے لئے میں نے اس کا نام وکیل صفائی رکھ دیا اور جلد ہی خاندان بھر میں رخسانہ ''باجی وکیل صفائی'' کے نام سے مشہور ہوگئی۔ وہ کہیں کسی کے حق میں کچھ بولنے لگتی تو محفل میں موجود بچے بڑے بول اُٹھتے ۔۔ آؤ جی، باجی وکیل صفائی اور ساتھ ہی ایک قہقہہ بلند ہو جاتا۔

رخسانہ میں خدا خوفی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی خصوصاً ملازمین کے لئے اللہ نے شاید اس کا دل موم سے تخلیق کیا تھا۔ کسی سوال کرنیوالے کو مایوس کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کی یہ عادت شادی سے پہلے کی تھی۔ شادی کے بہت بعد جب گھر میں کچھ بڑی بڑی چیزیں غائب نظر آنے لگیں تو تب یہ عقدہ کھلا کہ کسی اور کے ہاں کام کرنے والی نے دکھڑا رو دیا تو ''باجی رخسانہ'' سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے اندر سے وہ چیزیں نکال کر سائلہ کی بیٹی کے جہیز کیلئے دیدیں۔ ممانی جان سے ایک دفعہ بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ اس نے تو شادی سے پہلے اپنی ایک کام کرنے والی کو نئے اسٹیل کے برتن اور کمالیہ کے کھیسوں کا جوڑا نہایت خاموشی سے عنایت کر دیا تھا۔ میں اس لئے خاموش رہا کرتا کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ میری مغفرت کا سامان بھی کر رہی تھی۔ اگر میں کبھی بچوں کی ڈانٹ ڈپٹ کر رہا ہوتا اور وہ درمیان میں آجاتی تو بعد میں

بچے ماں سے لڑتے کہ امی آپ کیوں بیچ میں آتی ہیں؟ ابو بول رہے ہوتے ہیں تو بولنے دیا کیجئے۔ آپ وکالت کر کے ہمارا معاملہ اور بگاڑ دیتی ہیں۔

رخسانہ کو کھانے پکانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ جب رخسانہ بیاہ کر آئی تو پکانا تو دور کی بات اُسے آٹا تک گوندھنا نہیں آتا تھا لیکن اس کے من کے شوق نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور محض چھ ماہ کے عرصے میں اس نے انواع واقسام کے پکوانوں میں مہارت حاصل کر لی۔ رخسانہ کے ہاتھ میں ایک منفرد ذائقہ تھا اور امی اکثر کہا کرتی تھیں کہ رخسانہ کے ہاتھ میں ان کا ذائقہ بولتا ہے دراصل اس سلسلے میں رخسانہ نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ خصوصی طور پر مشرقی کھانے تو اس نے تمام امی سے سیکھے ہاں البتہ مغربی ڈشیں بنانے میں مختلف اسٹیشنوں پر آرمی آفیسرز کی بیگمات کے کلب کام آئے۔ غرضیکہ یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ رخسانہ کھانے پکانے میں یکتا تھی اور اگر اسے رسوئی کی ملکہ کا خطاب دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ ایک وقت میں اگر مختلف افراد کی مختلف فرمائشیں ہیں تو کسی کو بھی مایوس نہ کیا جائے۔ خاص طور پر یہ شمعل سے اسکی فرمائش ضرور پوچھی جاتی۔ اگر امی کے ہاں کوئی تقریب ہوتی تو وہ تمام تر ذمہ داری رخسانہ کو سونپ کر بالکل بے فکر ہو جاتیں۔ خود اس کے والد اور میرے سسر مرحوم ملک ریاض جب کبھی ہمارے ہاں آتے تو رخسانہ سے فرمائش کر کے آلو گوشت بنواتے جو انکا من بھاتا کھاجا تھا۔ رخسانہ کی رسوئی کی مہارت کا چرچا خاندان بھر اور دوست احباب میں عام تھا۔ ہر وہ بچی جس کے پرائے دیس سدھارنے کے دن نزدیک آتے، میری رفیقہ حیات اُسے باورچی خانہ سے اتنا ضرور واقف کر دیتی کہ اسے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ مجھے سہیل کی فکر نہیں ہوتی کیوں کہ جو کچھ پکے یہ خاموشی سے کھا لیتے ہیں جبکہ مجھے بچوں کے معاملے میں خاصی مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ فوج کی ملازمت کے دوران جو بھی اردلی ہمارے پاس ہوتا رخسانہ اُسے خاصا ماہر کر دیتی اور ایک وقت آتا کہ وہ محض نگرانی کا فرض انجام دیتی۔

کوئٹہ کے قیام کے دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ اکثر دوپہر کو ہمارا اردلی اشرف پوچھا کرتا تھا کہ باجی آج کیا پکانا ہے۔ جواباً رخسانہ اسے کچھ نہ کچھ بتا دیا کرتی تھی۔ ایسے ہی ایک روز اشرف نے حسبِ معمول یہ سوال کیا۔ نجانے وہ کس موڈ اور خیال میں بیٹھی تھی کہ بے اختیار بول اُٹھی۔

''اشرف! کیا پکانا ہے! چنے کی دال پکالو، وہی جو میرے نکاح میں لکھی ہے''۔

اس کے اس فی البدیہہ فقرے پر سب نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ اس کے اس جملے اور ایسی ہی کئی دوسری باتوں کا ایک دیر تک چرچا رہا۔ بیحد لطیف اور جاندار حسِ مزاح کی مالک جو مذاق کرنا اور برداشت کرنا جانتی تھی لیکن واحد ایک میری ذات تھی جس کا مذاق وہ کم ہی برداشت کرتی تھی۔ شاید مجھے مذاق کرنا نہیں آتا تھا یا پھر اُسے مجھ سے کچھ اور توقع تھی ہاں البتہ اس کے مذاق کو خواہ اس کا نشانہ میں ہی کیوں ناں ہوتا اگر میں پسند کرتا اور لطف اندوز ہوتا تو وہ کسی معصوم بچے کی طرح بیحد خوش ہوتی۔ اکثر شادی بیاہ کے موقعوں پر جب رت جگے ہوتے، منڈلیاں لگتیں تو رخسانہ ایسی تمام محفلوں کی جان ہوتی۔ اُسے ایسی رونق بیحد پسند تھی اور ایسے موقعوں پر وہ اپنے مزاح کے جوبن پر ہوتی۔ ان محفلوں میں جوں جوں رات بھیگتی جاتی، توں توں رخسانہ کی قصہ گوئی اور مزاح میں نکھار آتا جاتا۔ خاندان میں مشہور تھا کہ بیشک مشاہدہ کرلیا جائے، رات بارہ بجے رخسانہ کے وولٹیج پورے ہوتے ہیں اور بیٹری چارج ہو چکی ہوتی ہے۔

☆ ☆ ☆

محل میں دراڑیں

جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ ماموں ریاض کی اچانک رخصتی سے رخسانہ کو شدید صدمہ پہنچا اور وہ ایک ماہ تک اس سانحہ سے سنبھل نہ پائی۔ یہ مارچ ۲۰۰۰ء کی بات تھی اور اس کے چند ہی ماہ بعد ہم اسلام آباد منتقل ہو گئے تھے۔ ہم سب ہر چند اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتے تاہم کامیابی نادیہ اور جاوید کے دوسرے بیٹے وہاج بشیر کی آمد پر ہی ہوئی جس کی اگست ۲۰۰۰ء میں پیدائش ہوئی۔ اس کی آمد سے گویا رخسانہ کو نیا کھلونا مل گیا تھا۔ بیٹی اور نواسوں کی موجودگی نے اس کا دھیان بٹایا اور غم بھی ہلکا کرنے میں معاون ثابت ہوئے تاہم کسی کو یہ علم نہ تھا کہ کاتب تقدیر نے رخسانہ کی آئندہ زندگی کے لیے کیا آزمائشیں لکھی ہیں۔ نئی صدی کا آغاز میری رفیق زندگی کی حیات میں اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس کا مستقبل کا سفر کٹھن اور ناہموار تھا لیکن ہم ان سب باتوں سے بے خبر اپنی خوشیوں میں مگن تھے۔ رخسانہ کی صحت پہلے جیسی نہ رہی تھی جس کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی تاہم مجھے تشویش ضرور تھی۔ وہ پرہیز اور علاج کے معاملہ میں ازلی لاپروا اور غیر سنجیدہ تھی اور اس بات کا مشاہدہ میں اس کی سانس کی تکلیف کے سلسلہ میں کر چکا تھا کہ وہ تمام پرہیزیں جن کے بارے میں ڈاکٹر تنبیہہ کیا کرتے تھے وہ خاطر میں نہ لاتی تھی اور اس کی اس عادت پر میرا شدید احتجاج بھی لاحاصل ثابت ہوا کرتا تھا۔

شہر یار، ماشاء اللہ ۱۹۹۷ء میں ائرفورس میں جا چکا تھا اور اب اس کی پاسنگ آؤٹ کے دن نزدیک تھے۔ رخسانہ نہایت فخر سے ہر ایک سے اس بات کا تذکرہ کرتی۔ اسے شدت سے شہر یار کے پائلٹ بننے کا انتظار تھا اور بالآخر مارچ ۲۰۰۱ء کا وہ دن آ گیا۔ خاندان بھر میں سب بیحد خوش تھے لیکن رخسانہ کی خوشی سب سے الگ اور دیدنی تھی۔ جب کوئی اسے پائلٹ کی ماں کہتا تو اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔ اس کا اکلوتا اور نہایت پیارا بھائی فاروق اپنی علالت کے باوجود پاسنگ آؤٹ پریڈ دیکھنے آیا۔ بدقسمتی سے فاروق کو بھی سانس کی شدید تکلیف تھی جسے اس نے کثرت سگریٹ نوشی سے مزید بگاڑ لیا تھا۔ شہر یار کے کمیشن حاصل کرنے کے ایک ہی سال بعد فاروق کی طبیعت اچانک بگڑی اور ایک روز وہ کسی سے بھی کچھ کہے سنے بنا گھر کی دہلیز پر ہی مالک حقیقی سے جا ملا۔ فاروق نے اپنے پیچھے جوان بیوہ فاخرہ اور معصوم رابعہ، عمر، عنزہ اور ابوبکر یتیم چھوڑے۔ رخسانہ کے لئے یہ دوسرا شدید دھچکا تھا، باپ کے بعد بھائی بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ایک بھائی نوعمری میں ہی جگر کی بیماری کے باعث دنیا چھوڑ چکا تھا۔ رخسانہ جیسی حساس طبیعت کے لئے ایسے جانکاہ اور پے در پے صدمے کسی قیامت سے کم نہ تھے۔ اس نے بھائی کی موت کا بھی شدید اثر لیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ زندگی کی رونقوں سے بیزار ہوتی جا رہی تھی۔

اس کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ عام حالات میں بھی خواہ سردی ہو یا گرمی، بیمار ہو یا تندرست، وہ گھریلو کاموں کو اپنی مداخلت کے بغیر ہمیشہ نامکمل اور غیر تسلی بخش پاتی۔ بھلے ملازم رکھے ہوں لیکن ان کی موجودگی کا رخسانہ کی صحت اور آرام پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ جھاڑ پونچھ، صفائی ستھرائی، دھلائی استری، رسوئی کے معاملات غرضیکہ کچھ بھی ہو، یہ ناممکن تھا کہ کام ہو رہے ہوں اور آپ رخسانہ کو موقع پر موجود نہ پائیں۔ اسے ملازموں سے کام لینے کا فن آتا تھا۔ شاید ہی کبھی کسی دیکھنے والے یا کسی ملازم نے محسوس کیا ہو کہ وہ بیگمات کیطرح حکم چلا رہی ہے۔ خواہ فوج کی ملازمت تھی یا بعد کی زندگی، وہ کام کرنے والوں میں بیحد مقبول اور ہر

دلعزیز تھی۔ میں نے اکثر مذاق کرنا کہ مجبور و مستحقین کے حلقے میں الیکشن ہوں تو وہ بلا مقابلہ منتخب ہو جائے گی اور اس حقیقت میں ذرہ بھر بھی شائبہ نہ تھا۔ اس کی سانس کی تکلیف کی وجہ سے معالجین اسے بارہا گرد و غبار سے دور رہنے کی تاکید کر چکے تھے لیکن اس نے ہمیشہ ہر معالج کے انتباہ کو پس پشت ڈالا اور پر کاہ بھر اہمیت بھی نہ دی۔ عام آدمی کے معیار کے مطابق ملازموں سے کروائی گئی گھر کی جھاڑ پونچھ اور صفائی کے بعد بھی رخسانہ گھر کے کسی بھی صفائی شدہ کونے سے آدھا کلو کوڑا کرکٹ نکال لینے میں مہارت رکھتی تھی۔ گھر کے ہر کونے ہر کمرے کی روزانہ صفائی کیے بغیر وہ کبھی مطمئن نہ ہوتی۔ کسی روز کوئی کام کرنے والی چھٹی کر لیتی تو ہم سب اسے کمر کس کر کام میں جتا پاتے۔ میں اکثر قصداً اس کی دل شکنی بھی کر دیتا کہ شاید وہ بلا ضرورت مشقت سے باز آ جائے لیکن اس کے کان پر جوں تک نہ رینگتی بلکہ الٹا حوصلہ افزائی اور تعریف نہ کرنے پر مجھ سے ناراضگی کا اظہار کر ڈالتی۔

گو کہ عمر کے ساتھ ساتھ ہماری نوک جھوک بھی بڑھ گئی تھی لیکن ناراضگیوں کا دورانیہ بیحد مختصر ہو گیا تھا۔ چند گھنٹے، ایک دن یا حد دو دن اور بعض اوقات تو آدھ گھنٹہ بعد ہی ایسے لگتا تھا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہم دونوں نے اسے عمر کا تقاضا سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ میں الحمدللہ پچاس کی دہائی عبور کر چکا تھا جبکہ وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ لیکن ہم دونوں نے اب مذاقاً ایک دوسرے کو نام کے بجائے بابا اور مائی کہہ کر بلانا شروع کر دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ اپنی خوش دامن کے سامنے میں نے رخسانہ کو مائی کہا تو جھٹ سے بولیں،

''ہائے، ہائے میری معصوم چھوٹی سی بچی ہے اور تم اسے مائی کہہ رہے ہو''؟

میری ہنسی چھوٹ گئی اور فی البدیہہ منہ سے نکلا،

''امی جان میں اسے انگریزی والی مائی (My) کہتا ہوں, مطلب کہ، میری''۔

اس پر وہاں قہقہوں کا طوفان اٹھا۔ بعد کی زندگی میں بھی یہ مواقع کئی بار آئے کہ مجھے وضاحت پیش کرنی پڑتی کہ میری مراد انگریزی والی (My) ہے۔

یہ ۲۰۰۳ء کی بات ہے کہ رخسانہ اپنے معمول کے چیک اپ کے لئے ہسپتال گئی تو واپسی پر بجھی بجھی سی تھی لیکن میرے پوچھنے پر بات ٹال گئی۔ میں نے اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگلے روز اس نے اپنی ایک خالہ زاد کو فون کیا کہ اسنے کہیں جانا ہے وہ لے جائے۔ میں نے پھر پوچھا تو اس نے کوئی بہانہ کر دیا۔ مجُھے بات کچھ عجیب سی لگی لیکن خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ دیر بات نہ تو چھپا سکتی ہے اور نہ ہی چھپائے گی۔ وہی ہوا کہ اگلے ہی روز اس نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا اور بولی،

سُہیل! میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں''۔

میں نے مذاق میں کہا،'' کیوں مجھ فقرے کنگلے کو چھوڑ کر تو نہیں جا رہی ہو''؟

وہ نہایت سنجیدگی سے بولی،'' ہاں، شاید ایسا ہی ہو''۔

میں ایک دم سناٹے میں آ گیا اور گھبرا کر اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر پوچھا،

'' خیریت ہے کیا بات ہے''۔ میں اس کی آنکھوں کی نمی اور اداسی واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ رخسانہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی،

سُہیل! ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ مجھے ہیپاٹائٹس سی ہو گیا ہے''۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے زناٹے کا تھپڑ رسید کیا ہو۔ اچانک میرا خوبصورت محل زمین بوس ہو گیا لیکن نہایت ضبط سے خود کو سنبھالا اور اُسے اپنے سینے سے لگا کر بولا،

''بس اتنی بات؟ بکواس کرتے ہیں ڈاکٹر''۔

وہ حیران ہوئی کہ میں اسے معمولی بات کہے جا رہا ہوں مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ میرے اندر کیا طوفان برپا ہے۔ وہ بہت دیر میرے سینے سے لگی رہی اور ویسے ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی، شاید تھک چکی تھی۔ میرا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہتا تھا لیکن میری بناوٹی بہادری اور جرأت مجھے اس سے روک رہی تھی۔

غالباً یہ بھی ۲۰۰۳ء کے اوائل ہی کی بات ہے کہ رخسانہ پر ایک مرتبہ پھر سانس کی بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ اب تو ڈاکٹر بھی اس کو بگڑا ہوا دمہ کہنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ فوج میں علاج معالجے کی سہولت ریٹائرمنٹ کے بعد بھی حاصل ہوتی ہے سوفوراً اسلام آباد میں واقع پاکستان ائرفورس ہسپتال لے گیا۔ کچھ روز وہاں رہنے اور علاج کے بعد وہ صحت مند ہوئی تو چھٹی مل گئی لیکن ڈاکٹروں نے ایک مرتبہ پھر نہایت سختی سے اسے ان تمام مشقتوں اور گردوغبار سے دور رہنے کا کہا جو پہلے معالج بھی کہہ چکے تھے۔ اب تو اس ہسپتال کے میڈیکل اسپیشلسٹ نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر آپ کو اپنی زندگی کی ضرورت ہے تو بیحد احتیاط کریں۔ لیکن وہ رخسانہ ہی کیا جو ڈاکٹروں کا مشورہ بلا چون و چرا سعادتمندی سے مان لیتی۔ لگتا تھا کہ بیماریاں بھی قطار بنائے اپنی اپنی باری کی منتظر تھیں۔ ابھی صحت یابی کو بمشکل ایک ڈیڑھ ماہ ہوا تھا کہ اچانک اسے پتے میں شدید درد اُٹھا۔ ہم پھر ہسپتال بھاگے۔ ڈاکٹر نے پتہ میں پتھری کی تشخیص کی اور انجکشن تجویز کیے اور ساتھ ہی کہنے لگا،

''بہن آپ کسی بیماری کو معاف بھی کر دیں۔ آپ تو ڈھونڈ ھ ڈھونڈ ھ کر بیماریاں دریافت کر رہی ہیں۔'' وہ چند روز تک دوائیاں اور ٹیکے استعمال کرتی رہی لیکن اس سے محض وقتی سکون ہی ملتا تھا بالآخر انھوں نے بتا دیا کہ پتے کے آپریشن کے سوا کوئی چارہ نہیں اور ہمیں آپریشن کے لئے سی ایم ایچ راولپنڈی سے رجوع کرنے کو کہا۔ اب ایک دفعہ پھر رخسانہ ہسپتال کی مہمان تھی۔

یہ غالباً جولائی یا اگست ۲۰۰۳ء تھا۔ آپریشن والا دن رخسانہ نے شدید اذیت میں گزارا کیونکہ ہسپتال والوں کو جب یہ علم ہوا کہ وہ ہیپاٹائٹس سی کی مریضہ ہے تو آپریشن فنی وجوہات کی بنأ پر شام تک مؤخر کر دیا۔ دراصل اس کے مرض کیوجہ سے انہیں یہ آپریشن سب سے آخر میں کرنا تھا جس کے بعد آپریشن تھیٹر ضابطے کے مطابق استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شام آپریشن کے بعد ہم سب کی جان میں جان آئی اور تین دن ہسپتال میں رہنے

کے بعد وہ گھر لوٹ آئی۔ چار دن بمشکل سکون سے گزارے اور پھر وہی رخسانہ، وہی گھر کا کام کاج اور وہی جھاڑو پوچا۔

پتے کے آپریشن کے بعد رخسانہ کے چہرے پر اب تھکن کے آثار نمایاں نظر آنے لگے تھے۔ سانس کی بیماری، پھر ہیپاٹائٹس سی کی تشخیص اور اب پتھری تیسری بیماری تھی جس نے اسے گھیرا تھا لیکن وفا شعار، خدمت گزار اور بچوں سے ٹوٹ کر محبت کرنے والی رخسانہ ہر بات سے لاتعلق ہو کر اپنے گھر کو جنت بنائے رکھنے میں کوشاں تھی۔ مجھے نہیں علم کہ رب کریم نے اسے کہاں اور کس وقت بنایا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ فی زمانہ مشرقی اقدار کی پاسداری کرنے والی ایسی خاتون میں نے کم ہی دیکھی یا سنی ہوگی۔ کوئی ایسی عورت نہیں جو بیماری کی حالت میں بھی اٹھ اٹھ کر گھر کے ہر فرد کے لئے باوجود منع کرنے کے، ناشتے کھانے بنائے اور ٹرے ان کے آگے سجائے۔ ہزار منع کرنے کے باوجود وہ اپنی اس عادت سے باز نہ آتی۔ رخسانہ کی اور میری تکرار اب اکثر اسی بات پر رہنے لگی کہ تمہاری صحت اجازت نہیں دیتی بچے اپنے کام خود کر سکتے ہیں لیکن وہ بھلا کب کسی کی سنتی تھی؟

۲۰۰۴ء کی آمد ہوئی تو ہر مشرقی ماں کے طرح رخسانہ کے دل میں بھی اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان مچلنے لگا۔ اس معاملے میں دلہن پسند کرنا وہ روائتی پاکستانی خواتین کی طرح اپنا استحقاق سمجھتی۔ میں بار ہا پیار سے سمجھاتا کہ ہمیں بچوں کی پسند کا بھی احترام کرنا چاہیے۔ اپنے بندھن کی مثال دیتا۔ جب لاجواب ہو جاتی تو کسی معصوم بچے کی طرح ناراضگی اختیار کر لیتی۔ شہریار نے بھی کسی سعادت مند بچے کی طرح بالآخر کہہ دیا کہ چلیں امی جیسے آپ خوش مگر وہ پسند کیجئے گا جو میرے ساتھ موزوں لگتی ہو۔ رخسانہ کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ میرا ہمیشہ سے یہ نظریہ رہا ہے کہ کسی کی بچی کو دیکھنے سے پہلے کوشش کر لی جائے کہ اسکے بارے میں ہر قسم کی معلومات ممکنہ حد تک دستیاب ہوں اور اس کے بعد ہی اسے دیکھنے کے لئے جایا جائے تا کہ پسند ناپسند کی وجہ اصولی اختلاف ہو نہ کہ بچی کی شخصیت یا پیکر میں کسی عیب کو وجہ بنایا

جائے۔ کسی کے ہاں جانا چائے پانی پی کر، خاطر مدارت کرا کے بچی کو مسترد کر کے آ جانا میرے نزدیک ہمیشہ بہت بڑا جرم رہا ہے اور رخسانہ کو میں نے یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی۔ جلد ہی ہم لوگوں کو رابعہ پسند آ گئی اور بات بھی طے ہو گئی اور نومبر ۲۰۰۴ء میں ہم نے شہر یار کا نکاح طے کر دیا۔ رخسانہ اپنی خرابی صحت اور بیماریوں کو بھول کر شادی کی تیاریوں میں جت گئی اسے لاہور کے تواتر سے چکر لگانے کا بہانہ جو مل گیا تھا۔

میں غالباً یہ ذکر کرنا بھول گیا ہوں کہ رخسانہ کو لاہور سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ شادی کے فوراً بعد سے ہی وہ کسی معمولی تقریب یا واقعہ کو وجہ بنا کر لاہور کا چکر لگانے کا پروگرام بنا لیتی۔ دوران سروس مجھ سے اکثر پوچھتی کہ کیا اب ہمارا تبادلہ لاہور نہیں ہو سکتا؟ اکثر گلہ کرتی کہ آپ کی پوسٹنگ لاہور میں شادی سے پہلے کیوں ہوئی یہ بعد میں ہونی چاہیے تھی۔ اور میں اس کی معصومیت پر مسکرا کر رہ جاتا۔ میں رخسانہ سے شدید محبت کے باعث شادی کے شروع کے سالوں میں اس سے چار پانچ روز سے زیادہ دور نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ میں اس کے بارے میں بلاشرکتِ غیرے نظریہ کا حامل (Possessive) تھا لیکن شاید رخسانہ اس بات کو ایک عرصے تک سمجھ نہ پائی اور جب اسے اس بات کا علم ہوا اس وقت تک میں خود کو سمجھا چکا تھا کہ مجھے یہ فیصلہ رخسانہ پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ کتنا عرصہ لاہور جا کر رہتی ہے۔ جب بچوں نے سکول جانا شروع کیا۔ تو پھر اُسے بھی سالانہ گرمیوں کی تعطیلات یا موسم سرما کی مختصر چھٹیوں کا پابند ہونا پڑا جن کا اُسے سارا سال انتظار رہتا تھا۔ بچے سکول کالج میں پہنچے اور اس قابل ہوئے کہ اپنا خود خیال رکھ سکیں تو رخسانہ کو بھی چھٹیوں والی پابندی سے آزادی ملی اب وہ کسی چھوٹی بڑی وجہ، کسی خوشی غمی کو جواز بنا کر اکیلے بھی لاہور چلی جایا کرتی۔ لاہور جاتے ہوئے اس کی خوشی دیدنی ہوتی۔ کم از کم میں اس سے بہت محظوظ ہوتا۔ واپسی پر اس کے پاس قصے کہانیوں کا ایک پلندہ ہوتا اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے بھی شدت سے اس کی قصہ گوئی کا انتظار ہوتا کیونکہ جس انداز سے وہ سارے واقعات بیان کرتی مجھے یوں محسوس ہوتا گویا میں وہاں موجود تھا۔

رخسانہ کو اس فن میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ گھر کے واقعات سے شروع ہوتی اور لاہور شہر پر جا کر ختم کرتی۔ اس کی کہانی کے اختتام پر مجھے ہر بات کا بخوبی علم ہو جاتا کہ کون عزیز کس سے ناراض ہے۔ خاندان کے کون سے بچوں نے تعلیم میں نمایاں پوزیشن حاصل کی ہے، کس کی سگائی ہوئی ہے اور کس کا انتقال۔ یہاں تک کہ مجھے یہ بھی پتہ چل جاتا کہ آج کل لاہور میں نیا سٹور کونسا کھلا ہے، کونسی سڑک کی مرمت ہو رہی ہے اور اچھرہ میں نئی شے کیا مل رہی ہے۔ رخسانہ ہمیشہ لاہور کے تازہ خبر نامے کے ساتھ واپس آتی۔ رات تمام کاموں سے فراغت پانے کے بعد چائے کی گرما گرم پیالیاں اور کھانے پینے کا سامان ٹرے میں لگتا اور بستر پر ہماری محفل سجتی جہاں وہ خبر نامہ نشر کرتی اور بعض اوقات اسی دوران فجر کی اذان ہو جاتی اور ہم نماز پڑھ کر نیند کی وادی کا سفر اختیار کرتے۔ غرضیکہ رخسانہ کی اکثر گفتگو لاہور سے شروع ہوتی اور لاہور پر ختم ہوتی۔ اور بچے اکثر اسے اس بات پر تنگ بھی کیا کرتے تھے۔ رخسانہ کو اپنے قریبی عزیزوں خصوصاً خالاؤں سے دیوانگی کی حد تک پیار تھا۔ بعض اوقات میرے لئے یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہ اپنی امی سے زیادہ پیار کرتی یا اپنی خالاؤں سے۔ اس لئے اس نے دسمبر ۲۰۰۴ء میں اپنی خالہ عزیز (دردانہ کی والدہ) کی موت کے صدمے کا بھی شدید اثر لیا۔ ایسے حالات میں اس کی صحت بگڑ جایا کرتی۔ اکثر کسی عزیز رشتہ دار کی موت کو اگر میں اس سے چھپاتا تو وہ مجھ سے شدید ناراض ہو جایا کرتی اور میرے لئے یہ خاصی پریشان کن صورتحال ہوتی اور کسی ایسے موقع پر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ اس بارے میں اسے خبر پہنچائی جائے یا پوشیدہ رکھی جائے۔ ہم شہریار کی شادی کی تاریخ طے کر چکے تھے اور مارچ ۲۰۰۵ء میں شہریار، رابعہ کو بیاہ کر لے آیا۔ ایک عدد بہو کی ساس ہونے کے فخر نے رخسانہ کے چہرے پر ایک بار پھر خوشیاں بکھیر دیں لیکن ولیمے کے روز ہی اسے ایک اور جانکاہ صدمے سے دوچار ہونا پڑا جب اس کی سب سے چھوٹی خالہ نسیم جو خالہ گڈو کے نام سے مشہور تھیں اچانک داغِ مفارقت دے گئیں۔ اذیت کن بات یہ تھی کہ وہ ایک روز پہلے شادی کی تقریب میں ہنسی خوشی شریک تھیں لیکن چوبیس گھنٹوں بعد ہی وہ ہماری

آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھیں ۔رخسانہ کا ان سے بہنوں جیسا پیار تھا۔ان کی موت نے ولیمے کی تقریب کو خاصا سوگوار کر دیا۔تاہم یہ وقت بھی گزر گیا۔سال ۲۰۰۶ء ہمارے چھوٹے سے خاندان میں حمنہ سہیل کی آمد کی خوشخبری لے کر آیا۔حمنہ شہریار اور رابعہ کی پلوٹھی کی اولاد تھی۔ننھی منی گڑیا سی پوتی پا کر رخسانہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔گو کہ ہیپاٹائٹس کا مرض دن بدن کمزور کر رہا تھا لیکن وہ اس حقیقت سے بے پروا، والہانہ انداز میں پوتی کے لاڈ اٹھانے میں مصروف تھی۔انہی دنوں اس کی صحت میں شدید گراوٹ نمایاں ہونے لگا۔ہم ایک مرتبہ پھر ہسپتال دوڑے تو معلوم ہوا کہ اندرونی نظام و اعضاً بری طرح متاثر ہیں اور بات ایک اور آپریشن تک پہنچ چکی ہے۔میں جو اس کی صحت کے لئے پہلے ہی بے حد فکر مند رہتا تھا اس خبر کو قبول نہ کر سکا لیکن بہرحال یہ ایک حقیقت تھی۔بڑی بیٹی نادیہ کو پتہ چلا تو اس نے اصرار کیا کہ امی کو اس کے پاس فیصل آباد بھیج دیا جائے کیونکہ وہ وہاں کسی قابل سرجن کو جانتے تھے جو جاوید کا دوست تھا۔

کہتے جب بری خبریں آتی ہیں تو پھر غولوں میں آتی ہیں۔ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔مارچ ۲۰۰۶ء میں آپریشن کی تیاری سے قبل ایک اور دکھ دینے والا انکشاف ہوا کہ رخسانہ کو تو ذیابیطس بھی ہو چکی ہے۔دل میں سوچا کہ یا اللہ! اتنی معصوم اور ناتواں جان پر اتنی آزمائشیں کیوں؟ میں اپنے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گیا اور بے ساختہ رو کر دل کی بھڑاس نکالی کہ یا اللہ ہماری خطائیں معاف کر دے۔میری عزیز از جان رفیق سفر کو صحت کلی عطا فرما کہ میں اس کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔آپریشن خاصا بڑا تھا اور بیکار اعضاء کو نکالنا پڑا کہ وہ صحت کو شدید متاثر کر رہے تھے۔جاوید اور نادیہ نے دل و جان سے رخسانہ کی خدمت کی۔وہ فیصل آباد میں تقریباً ایک ماہ ان کے پاس رہی اور روبصحت ہونے پر واپس آئی لیکن یہ پہلے والی رخسانہ نہ تھی بلکہ نہایت کمزور اور لاغر جسے دیکھ کر میرا دل روتا تھا۔بہرحال مستقل علاج اور طاقت کی دوائیوں سے اس کی صحت بہتر ہونا شروع ہوئی۔اب اسے ایک اور پابندی کا سامنا تھا اور وہ تھا

ذیابیطس کی پرہیز، مگر صحت کے معاملے میں باغی اور علاج پرہیز کے معاملات میں یکسر نافرمان رخسانہ نے اسے بھی کوئی اہمیت نہ دی تھی۔اسی بات نے میرے اندر ایک خوف پیدا کر دیا تھا۔سانس کی تکلیف، پتے کا آپریشن، ہیپاٹائٹس سی، ایک اور بڑا آپریشن اور پھر ذیابیطس کا انکشاف! ایک ساتھ اتنی بیماریاں؟ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

دکھوں کی چادر

مجھے دن رات یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ یا اللہ یہ بے غرض اور خدمت گزار عورت اپنی گرتی ہوئی صحت کا ذرہ بھر خیال کئے بغیر دن رات انتھک انداز میں اپنے گھر کو قائم رکھنے میں دیوانگی کی حد تک منہمک ہے، ایسے میں تو ہی اسے عقل عطا فرما کیونکہ میری تو یہ بالکل نہیں سنتی۔ میں نے آج تک کبھی کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن آج اس یادوں کی ترنجن پر اس بات کا انکشاف کر رہا ہوں کہ ہیپا ٹائٹس سی کی بیماری کے انکشاف کے بعد سے ہی میرے دل میں اس خوف نے گھر کر لیا تھا کہ رخسانہ مجھ سے کسی بھی وقت چھین لی جائے گی۔ میں اس خیال کو جتنا ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا یہ اتنا ہی میرے اعصاب پر سوار ہوتا۔ وہ نادیہ اور شہریار کی ذمہ داریوں سے تو بخوبی واحسن فارغ ہو چکی تھی اب اسے جویریہ کا گھر بسانے کی فکر ستائے جا رہی تھی۔ اس کی دانست میں یہ کام لیٹ ہو رہا تھا۔ جویریہ مجسمہ سازی میں انفرادی اعزاز حاصل کرنے کے بعد لاہور کے مشہور زمانہ تعلیمی ادارے نیشنل کالج آف دی آرٹس میں ماسٹرز کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ اللہ نے مدد کی ایک اچھا رشتہ آیا۔ نہایت شریف، مذہبی اور چاہت کرنے والا گھرانہ۔ بچہ امریکہ میں تھا اور میرا ہم نام یعنی سہیل جس کا اتفاق سے انہی دنوں پاکستان آنا ہوا اور ایک آدھ ملاقاتوں کے بعد دونوں گھرانے اس بندھن کو انجام تک پہنچانے کے لئے تیار ہو گئے کیونکہ سہیل کو واپس جانا تھا اور جویریہ کی امیگریشن کے لئے

کاغذات بھی پورے کرنے تھے سو جنوری ۲۰۰۷ء میں نکاح کا فیصلہ ہوا جاوید نے حسب عادت انتظامات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور جویریہ کا نکاح جسے ہم پیار سے بیلا کہتے ہیں بخیر و خوبی انجام پا گیا۔

میں غالباً پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ یوں لگتا تھا جیسے نئی صدی کا آغاز ہمارے لئے آزمائشیں اور امتحانات لیکر آیا تھا۔ گو خوشیوں کے کئی مواقع بھی آئے لیکن عمومی طور پر آزمائشوں اور پریشانیوں کا راج رہا جس میں اموات کے ساتھ ساتھ رخسانہ کی طویل ہوتی بیماریوں کو نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ وقت گزرتا گیا اور پھر اگست ۲۰۰۷ء کا مہینہ آ گیا جس نے ہماری آنے والی زندگی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ یہ ۶/ اگست کی صبح تھی کوئی دس ساڑھے دس کا وقت تھا اور میں اپنی میز پر بیٹھا ایک روزنامے کیلئے اپنا ہفتہ وار کالم ''پانچواں کالم'' تحریر کر رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب میری پیاری بیٹی نادیہ کی بین کرتی آواز تھی،

''ابو جی، ابو جی! جاوید مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں''۔

اور فون بند ہو گیا۔۔۔۔ میں ایک لمحے کے لئے سناٹے میں آ گیا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ماجرا ہے؟ حقیقت ہے یا مذاق، واپس کال کی لیکن کسی نے فون نہیں اُٹھایا۔ کچھ دیر بعد اوسان قدرے بحال ہوئے تو یقین آیا کہ کوئی قیامت گزر گئی ہے۔ کوئی بھی فون آتا رخسانہ کی عادت تھی کہ ضرور پوچھتی کہ کس کا فون تھا۔ حسبِ عادت آواز سن کر رسوئی سے پوچھنے آئی کہ کس کا فون تھا؟ خبر دینی بھی لازمی تھی اور رخسانہ کی طبیعت، خراب صحت اور کمزور دل کا بھی بخوبی علم تھا۔ دل میں آیا کہ اگر اسے صاف صاف بتا دیا کہ جاوید ہمیں داغ مفارقت دے گیا ہے تو شاید ایک اور صدمہ نہ دیکھنا پڑ جائے۔ مجھے ایک لمحے میں فیصلہ کرنا تھا سو فوراً کہا کہ آپی (ہم نادیہ کو آپی کہتے ہیں) کا فون تھا بتا رہی تھی کہ جاوید اچانک بے ہوش ہو گیا ہے اور کومے میں ہے۔ رخسانہ کلیجہ تھام کر بستر پر ڈھے گئی۔ بڑی مشکل سے سنبھالا اور بچوں کو فوراً نکلنے کیلئے تیار کیا۔ راستے میں عزیز و اقارب کے بے تحاشا فون آنے شروع ہو گئے۔ ہر کوئی

جنازے کا وقت پوچھ رہا تھا اور میرا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ کسی سے صاف بات بھی نہیں کر پا رہا تھا کہ کہیں رخسانہ کو حقیقت کا علم نہ ہو جائے۔ راستہ تھا کہ کٹ ہی نہیں رہا تھا اور رخسانہ کی دعائیں تھیں جو تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں،

''یااللہ! میری بچی کا سہاگ بچا لینا''۔

فیصل آباد داخل ہوتے ہی رخسانہ سے صرف اتنا کہا کہ آپی بتا رہی تھی کہ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ صورتِ حال تشویشناک ہے۔ جاوید اور نادیہ کچھ ہی عرصہ پہلے ہی یہ گھر بنا کر بڑے ارمانوں سے یہاں منتقل ہوئے تھے۔ یہ گلی میں آخری گھر تھا اور موڑ مڑنے کے بعد نظر آتا تھا۔ ہم جونہی موڑ مُڑے گلی میں حسب توقع ہجوم اور شامیانے لگے نظر آئے تو رخسانہ کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے اسے بتایا کہ اسکا جیدی (جاوید) ہمیں چھوڑ کر جا چکا ہے۔ رخسانہ ایک چیخ مار کر سکتے میں چلی گئی۔ بمشکل سنبھالا دیکر اندر لیکر گئے۔ بیوہ بیٹی کی آنسوؤں کی جھڑی اور کلیجہ چیرنے والے بین میرے دل پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ رخسانہ کی کیا حالت تھی؟ یہ دیکھنے کا مجھے ہوش کہاں تھا۔

جاوید کی موت ہی شاید وہ دھچکا اور سانحہ تھا جس کے بعد رخسانہ ہمت ہار گئی تھی۔ کوئی دو سال قبل ہی رخسانہ دین کی طرف سنجیدگی سے راغب ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں اس کی بہترین دوست اور پڑوسن نگہت عمر بہن کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ہمارے دکھ سکھ میں ہر موقع پر شریک ہونے والے عمر بھائی اور نگہت بہن کیلئے ہمارے دونوں کے دلوں میں ہمیشہ بے انتہا احترام رہا ہے۔ رخسانہ نے تجوید سے قرآن پاک اور اسکی تفسیر کا مطالعہ شروع کیا تھا اور اب اس قیامت نے اسے دین سے مزید قریب کر دیا۔ اس نے باقاعدگی سے قرآن کلاسوں میں شمولیت بھی شروع کر دی تھی لیکن مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ جوان بیٹی کا دکھ اُسے اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹے جا رہا تھا۔

جاوید کی رحلت کے ایک آدھ ماہ بعد ہی پتہ چلا کہ سہیل امریکہ سے چند دنوں کی

رخصت پر آرہا ہے اور وہ جویریہ کو ساتھ لیجانا چاہ رہا ہے۔ مجھے کچھ اپنے حالات اور کچھ جیدی کی موت کے سانحہ کی بناء پر کوئی فیصلہ کرنے میں ہچکچاہٹ کا سامنا تھا لیکن رخسانہ کی رائے تھی کہ ہمیں اس نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ خود نادیہ بھی اسی خیال کی مالک تھی کہ اس کے نصیب میں اللہ نے جو لکھا تھا وہ تو ہو گیا لیکن اب بیلا اسکی وجہ سے کیوں کسی آزمائش کا شکار ہو۔ چنانچہ جنوری ۲۰۰۸ء میں ہم نے بیلا کی رخصتی کر دی۔ جاوید کے بغیر اس گھر کی کوئی بھی خوشی اب ادھوری لگتی تھی لیکن مشیت ایزدی کے سامنے بھلا کس کو دم مارنے کی مجال ہے۔ رخصتی کے ہر ہر لمحے پر سب نے لیکن رخسانہ نے خاص طور پر جاوید کو بے حد یاد کیا۔ دوسرے داماد سہیل تحمل کی انکساری اور خوش مزاجی نے رخسانہ کی خاصی ڈھارس بندھائی لیکن جاوید کی کمی کو وہ کبھی بھی نہ بھولی۔ اپنے خاوند کی واپسی کے ایک دو ماہ بعد جویریہ (بیلا) بھی امریکہ سدھار گئی۔ مئی میں اللہ نے ہمیں ایک اور پیاری سی پوتی اور شہریار و رابعہ کو گڑیا سی بیٹی دعا سہیل عطا کی۔

بچوں میں رخسانہ کی جان ہوتی تھی۔ اپنا دکھ تکلیف سب بھول کر وہ دعا کے لاڈ پیار میں مشغول ہو گئی۔ بہو کو خاصی دیر پاس رکھا اور گرتی ہوئی صحت کے باوجود دعا کو مکمل طور پر سنبھالا۔

چونکہ رخسانہ باقاعدگی سے شوگر اور ہیپاٹائٹس سی کے لئے علاج کروا رہی تھی سو ایک موقع پر ڈاکٹروں نے محسوس کیا کہ اس کا ہیپاٹائٹس کا مرض بتدریج بگڑ رہا ہے اور ٹیکوں کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔ جنہیں اس موذی مرض اور اس کے علاج کے بارے میں علم ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ٹیکوں کا کورس کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ چھ ماہ کا کورس تجویز ہوا جس میں ہر تیسرے روز ایک انجکشن لگنا تھا۔ ٹیکے کے بعد کی حالت، بخار، چڑاچڑاپن دیکھا نہ جاتا تھا۔ مجھے بحیثیت ریٹائرڈ سرکاری ملازم یہ سہولت حاصل تھی سو اللہ نے کرم کیا اور کورس شروع ہو گیا۔ نادیہ نے جو ہمارے پاس بچوں سمیت منتقل ہو چکی تھی ٹیکہ لگانے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ آفرین ہے اس بہادر عورت پر جس نے علاج کے دوران نہ ہی کام سے پرہیز کی اور نہ ہی

تھکاوٹ کی شکایت ۔ میں آج اسے بہادر عورت کہنے پر اسلئے مجبور ہوں کہ میرے پاس اس دیوانی عورت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کیلئے کوئی اور الفاظ بھی تو نہیں لیکن بیماری کی حالت میں جب وہ اس جنون کا مظاہرہ کیا کرتی تھی تو میں بلا تامل اسے خبطی اور بیوقوف کہا کرتا تھا۔ چھ ماہ کا کورس اللہ اللہ کر کے ختم ہو گیا لیکن ہمارے لئے کوئی اچھی خبر نہ لایا ٹیسٹ کے نتائج مثبت نظر آئے۔ مرض جوں کا توں موجود تھا۔

اس علاج کے دوران میری اکلوتی ہمشیرہ حمیرا جاوید جس کی شادی کے بعد فیصل آباد میں رہائش تھی، متعدد بیماریوں کا شکار ہو کر جولائی ۲۰۰۸ء میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئی۔ رخسانہ اور حمیرا کا آپس میں بے حد پیار تھا۔ حمیرا کا انتقال ہم میں سے کسی کے لئے بھی اچھی خبر نہیں تھی لیکن علیل اور صحت کھوتی ہوئی رخسانہ کے لئے یہ ایک جاں کاہ خبر تھی۔ زندگی کی امنگ اور شکست کے دھڑکے کے درمیان کشمکش، رخسانہ کے رویئے میں بخوبی محسوس کی جاسکتی تھی۔ اب اس نے وقتاً فوقتاً مجھ سے اس بات کا اظہار بھی کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ الگ بات تھی کہ میں ہمیشہ اس کی بات کو مذاق میں ٹال کر اس کے وہم کو ڈائیلاگ بازی کا نام دے دیا کرتا لیکن سچ یہ ہے کہ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ جاتی اور میں ایک وحشت ناک انجانے خوف کے باعث جھرجھری لے کر رہ جاتا۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ رخسانہ کا سب بچوں اور بچوں کے بچوں سے بے پناہ پیار مثالی تھا لیکن بڑے نواسے شمل، پوتی حمنہ، اور سب سے چھوٹے بیٹے سرمد سہیل سے اس کا پیار بالکل مختلف قسم کا تھا۔ سب اکثر مذاق میں کہا کرتے تھے کہ یہ تین بچے کبھی کوئی مقدمہ نہیں ہار سکتے کیوں کہ ان کا وکیل صفائی (رخسانہ) نہایت تگڑا ہے۔ شمل چونکہ اگلی نسل میں سب سے پہلا بچہ تھا اس لئے پیارا تھا مگر حمنہ کے بارے میں جب ہمیں یہ پتہ چلا کہ وہ آٹزم (Autism) کا شکار ہے تو رخسانہ کا تو جیسے کلیجہ کٹ کر رہ گیا ہو، چنانچہ وہ دادی کی خصوصی توجہ کی حقدار ٹھہری۔ سرمد چونکہ سب بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اس لئے ماں

کا بیحد لاڈلا تھا۔ دونوں میں دوستوں اور سہیلیوں والا پیار تھا۔ بہت سی باتوں کا ہم میں سے کسی کو بھی علم نہیں ہوتا تھا۔ اور یہ دونوں ماں بیٹا معاملات طے بھی کر لیتے تھے۔ اکثر اگر میں ان دونوں کی کوئی چوری پکڑتا تو رخسانہ کا جواب ہوتا کہ میں آپ کو بتانے ہی والی تھی۔ رات سونے سے پہلے اس کا معمول تھا کہ سرمد کے کمرے میں جا کر اس سے ٹانگیں دبواتی اور ملکی و خاندانی حالات پر سیر حاصل تبادلۂ خیال کرتی۔

۲۰۰۹ء کے اواخر میں رخسانہ نے میرے کان میں بات ڈالنی شروع کر دی کہ سرمد مزید تعلیم کے لئے برطانیہ جانا چاہتا ہے جو اس وقت ACCA کر رہا تھا اور مجھے بخوبی علم تھا کہ برطانیہ میں تعلیم کس قدر مہنگی تھی اور مزید یہ کہ میری پسلی ایسے کسی چونچلے کی اجازت نہیں دیتی تھی، لیکن یہ رخسانہ کا عزم، بیٹے کے لئے اسکی محبت اور اللہ کا کرم تھا کہ اس نے میری ساتھی کی خواہش کو بار آور کیا۔ بڑی بہن نادیہ بھی چونکہ سرمد سے بیحد پیار کرتی تھی سو اس نے بھی بڑھ چڑھ کر تعاون کیا اور یوں سرمد، ماں کی خواہش کو حقیقت کا روپ دیتے ہوئے ۲۰۱۰ء کے شروع میں دو سال کے لئے برطانیہ چلا گیا۔ اس نے بیٹے کی غیر موجودگی کو محسوس بھی کیا لیکن خوش تھی کہ جو وہ چاہتی تھی اللہ نے اس خواہش کو پورا کر دیا۔

وقت گزر گیا۔ صحت کے حوالے سے میری رفیق زندگی کی حیات میں بھی اتار چڑھاؤ آتے جاتے رہے۔ مجموعی طور پر رخسانہ کی صحت بہت گر چکی تھی۔ نہ وہ کھلا چہرہ، نہ رنگ روپ اور نہ ہی جلد کی شادابی و تر و تازگی باقی رہی تھی۔ وزن بھی دن بہ دن گرتا جا رہا تھا۔ تمام علاج جاری تھے لیکن ان سے منسلک نقصانات بھی اپنا کام کر رہے تھے زندگی کی روانی میں ایک اور سال گزر گیا اور اب آمد تھی سن ۲۰۱۱ء کی۔ ہم میں سے کسی کو بھی اس بات علم نہیں تھا کہ یہ سال خوشخبریاں کچھ کم ہی لا رہا تھا جبکہ آزمائشوں اور امتحانات کا ایک ٹورنیڈو (بگولہ) اٹھنے والا تھا۔

اکتوبر میں رب کریم نے شہریار کو تیسری بیٹی سے نوازا۔ سارینہ شہریار کی آمد پر

رخسانہ نے ایک روائتی مشرقی عورت کی طرح دبے دبے الفاظ میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ، ''کیا تھا اگر اللہ میرے بچے کو اس دفعہ بیٹا عطا کر دیتا''، لیکن میں نے اسے تفصیل سے سمجھایا اور اس کے دین سے لگاؤ کا حوالہ دے کر اسے قائل کیا کہ اس کی سوچ غلط ہے۔ رخسانہ نے جب تسلی دینے کی غرض سے شہر یار کو کہا کہ بیٹا، فکر نہ کرنا، بیٹیاں بھی اللہ ہی کی نعمت ہیں تو اس نے مسکراتے ہوئے بہادری سے جواب دیا کہ خوش قسمت ہے وہ جس کے گھر اللہ کی رحمتیں اتری ہیں اور یہ کہ رسول پاک ﷺ کی حدیث مبارکہ کی روشنی میں اب تو وہ کنفرم جنتی ہو گیا ہے۔ سارینہ کی پیدائش کو چند ہی روز گزرے تھے سرمد بھی تعلیم مکمل کر کے واپس آ چکا تھا کہ ایک روز ہمیں مرحومہ ہمشیرہ حمیرا کے شوہر جاوید اقبال کے دنیا چھوڑنے کی خبر ملی۔ انہی دنوں امی بھی کافی علیل تھیں اور ہم انہیں ایسی کوئی خبر نہیں دینا چاہتے تھے سو فیصلہ ہوا کہ سب بھائی سوائے عامر کے فیصل آباد جائیں گے۔ عامر امی کے پاس رہتا تھا سو اسے چھوڑنا پڑا کہ اگر امی پوچھیں تو بہانہ کر دے کہ جاوید شدید علیل ہے اسے دیکھنے گئے ہیں۔ یہ ماہ اکتوبر ۲۰۱۱ء کا آخری دن تھا۔ رخسانہ نے اس موت کا بھی شدید صدمہ لیا۔ دو دن بعد واپس آئے تو پتہ چلا کہ امی کی حالات خاصی بگڑ چکی ہے۔ ان کے پھیپھڑوں میں پانی داخل ہو چکا ہے اور سانس لینے میں بھی دشواری پیش آ رہی ہے۔ ہم دونوں فوراً امی کو ملنے گئے تو امی ہوش میں لیکن خاصی تکلیف میں تھیں اور وقفے وقفے سے غنودگی میں جا رہی تھیں۔ ہم رات دیر تک بیٹھے رہے اور جب اٹھنے لگے تو امی نے خواہش کا اظہار کیا کہ رخسانہ کو ان کے پاس چھوڑ دیا جائے۔ میرے کچھ کہنے سے قبل ہی رخسانہ نے ہامی بھر لی اور مجھے حکم دیا کہ آپ کا روز چکر لگا ہی کرے گا سو کل میرے کچھ کپڑے وغیرہ آتے ہوئے لے آئیں۔ اس سے پہلے بھی اگر کبھی امی علیل ہوئیں یا ہسپتال داخل ہوئیں تو ان کی خواہش ہوتی کہ صرف اور صرف رخسانہ انکی تیمارداری اور دیکھ بھال کیلئے ساتھ ہو۔ رخسانہ جس نے کبھی غیروں کو ایسی خدمت کے لئے انکار نہیں کیا تھا بھلا وہ اپنی ماں جیسی ساس کو کیسے مایوس کر سکتی تھی۔ امی دل کے عارضہ میں ایک عرصہ سے مبتلا تھیں سو اگر میں

کبھی گھبراتا تو رخسانہ میرے ساتھ جا کر انہیں لے آتی اور ان کی جی جان سے خدمت کرتی۔ اکثر ملنے جلنے والے اور دوست احباب کہتے کہ یہ ساس بہو نہیں بلکہ ماں بیٹی کا رشتہ لگتا ہے۔ امی کو کبھی مجھ سے کوئی شکایت ہوتی تو رخسانہ سے اس کا گلہ کرتیں اور رخسانہ اس وقت چین سے نہ بیٹھتی جب تک وہ مجھ سے امی کو فون یا معذرت نہ کروالیتی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اتنی شدید بیماری میں چھوٹی بہو کے پاس ہوتے ہوئے بھی جو اُن کا ہر طرح خیال رکھ رہی تھی، رخسانہ ہی کو اپنے پاس رہنے کا کہا۔ میں باقاعدگی سے روز شام کو امی کو ملنے جاتا۔ وہ ہمت چھوڑ چکی تھیں مگر جب انہیں ہسپتال لے جانے کا کہتا تو جواب دیتیں کہ میں سکون سے رخصت ہونا چاہتی ہوں اگر مجھے ناراض کرنا چاہتے ہو تو مجھے اٹھا کر لے جاؤ۔ امی کی غنودگی بڑھتی جارہی تھی۔ اب ہمیں نظر آرہا تھا کہ ان کی زندگی کا سورج کسی بھی وقت غروب ہوسکتا ہے۔ یہ وہ دبنگ عورت تھی جو ساری عمر ماسوائے اپنے رّب کے کبھی کسی کے سامنے نہ جھکی تھی۔ جوانی میں مسلم لیگ کی طالبات کی قیادت کرتے ہوئے سول نافرمانی کے دوران لاہور سیکرٹریٹ پر مسلم لیگ کا پرچم لہراتے ہوئے پیش پیش تھیں لیکن پاکستان بننے کے بعد گمنامی میں جانے کو ترجیح دی۔ اکثر اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی چینل انٹرویو کے لئے رجوع کرتے تو نہایت بددلی سے ہامی بھرتیں۔ تاریخ کی کتاب ایک اور ورق الٹنے والی تھی۔ غنودگی بڑھتی گئی تو امی نے خود کلامی شروع کر دی اور کہنا شروع کر دیا کہ مجھے اردو کا آٹھ کا ہندسہ (۸) بہت تنگ کر رہا ہے۔ ۷ر نومبر ۲۰۱۱ء کو عید الاضحیٰ کا دن تھا۔ میں عید کی نماز پڑھ کر گھر لوٹا تو چھوٹے بھائی عامر کا فون تھا۔ روتے ہوئے بولا کہ امی کسی بات کا جواب نہیں دے رہیں۔ میں گاڑی لے کر فوراً پہنچا اور آواز دی۔

''امی، میں سُہیل ہوں، میں آ گیا ہوں''۔ میری آواز پر بمشکل آخری بار دائیں آنکھ ضعیف انداز میں کھول کر اثبات میں سر ہلایا۔ ہم ہسپتال لیکر دوڑے، عید کا پورا دن ہسپتال میں گزرا لیکن امی نے کسی کے بلکنے یا سسکنے کی پروا نہ کی اور شام میں، ہم سے رخصت ہوگئیں۔ رخسانہ نے ان کی موت کا بھی بیحد اثر لیا۔ امی کی وصیت کے مطابق وہ غسل دینے والوں میں

شامل رہی۔ساس کی وفات کے بعد سے رخسانہ نے برملا کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اب ٹھیک نہیں ہوگی اور میں اسے درشتی سے ڈانٹ دیا کرتا تھا۔امی کی وفات چندہی روز بعد ہمیں امریکہ سے جویریہ کہ ہاں بیٹے رایان تجمل کی ولادت کی خبر ملی جس سے رخسانہ کا دھیان کچھ بٹ گیا۔اب اسے رایان سے ملاقات کا انتظار تھا چنانچہ دن گننا شروع کر دیئے۔

☆ ☆ ☆

سنبھالو اپنی دنیا

ایک وقت تھا میں کبھی بھی کسی کی سالگرہ نہیں بھولا کرتا تھا، خصوصاً رخسانہ کی سالگرہ اور ہماری شادی کی سالگرہ بھولنا تو میرے لئے قطعی ناممکن تھا۔ عموماً سالگرہ کے روز میں اسے حسب حیثیت کوئی تحفہ دے کر چونکا دیا کرتا تھا۔ بچے میرے ساتھ ملکر سرپرائز پارٹی کا اہتمام کرتے اور پھر جب اس کے سامنے کیک لایا جاتا تو حیرت زدہ رخسانہ کی چمکتی آنکھوں میں ناچتی خوشی دیکھ کر ہم سب مسرور ہوتے۔ اس کے برعکس وہ اکثر میری سالگرہ بھول جایا کرتی تھی اور میری خواہش ہوتی کہ وہ ہر سال میری سالگرہ بھول جایا کرے۔ اکثر بچے پاس ہوتے تو اسے خبردار کر دیتے وگرنہ میری من کی مراد پوری ہو جاتی۔ اس کی وجہ بس اتنی سی تھی کہ مجھے اس طرح جھوٹ موٹ کی ناراضگی ظاہر کرنے کا موقع مل جاتا تھا اور پھر جس محبت، معصومیت اور پیار سے وہ معذرت کر کے مجھے منایا کرتی تھی میں اس کا لطف ایک عرصہ تک محسوس کرتا رہتا تھا۔

ایک دفعہ کہنے لگی، ''سہیل آپ کو پتہ ہے کہ مجھے یاد نہیں رہتا، آپ خود مجھے یاد کیوں نہیں کرادیا کرتے''؟

مجھے اس کی سادگی پر بے اختیار پیار آیا اور اسکے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ''میری جان! اگر تمہیں بتادیا کروں تو تمھاری یہ محبت مجھے کہاں سے ملے گی''؟

اوراس نے سرخ چہرے کے ساتھ شرما کرآنکھیں نیچی کرلیں۔

وضعداری، صلہ رحمی ،مہمان نوازی، شفقت،غریب پروری اور محبت بانٹنے میں،رخسانہ اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔میں اکثر کہا کرتا کہ ماسوائے میرے،اسکے دل میں پوری دنیا کے لئے محبت،شفقت اوررحم کوٹ کوٹ کربھرا ہوا ہےتو پیار سے جواب دیتی،

''وے بابے! یہ تیرادیا ہوااعتاد ہی تو ہے''۔

شادی کے شروع کے چند سالوں کی غلط فہمیوں کے فوراً ہی بعد ہم نے ایک دوسرے کو بخوبی سمجھنا شروع کردیا تھا۔ہم ایک دوسرے کے موڈ اور انداز سے اندراٹھنے والی ہر بات کو بھانپ لیتے تھے۔ہم دونوں کو معلوم ہوتا کہ کون کس وقت کیا کہنا چاہتا ہے۔کسی ایک کے فیصلے پر دوسرا ناراض ہے یا خوش ہے۔فلاں بات ایک دوسرے سے کس موقع پر کرنی ہے یا بالکل بھی نہیں کرنی۔میں نے گھر مکمل طور پر رخسانہ کی صوابدید پر چھوڑا ہوا تھا اور گھریلو معاملات میں قطعی داخل نہ دیتا تھا۔ہاں اپنے کنبہ کے لئے کچھ اصول وضع کرر کھے تھے اوراسے علم تھا کہ میں اس سے اور بچوں سے ان اصولوں کی پاسداری اور ضابطوں کی پابندی چاہتا ہوں۔یہ فقط رخسانہ کا استحقاق تھا کہ ناگزیر حالات میں وہ ان میں سے کسی ایک کی خلاف ورزی کرتی اور پھر نہایت محبت اور پیار سے مجھے قائل کرلیتی کہ اس نے جو کیا ان حالات میں وہی درست تھا اور یہ کہ میرے ناراض ہونے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔میں اس ''کامیاب ترین وکیل صفائی'' کی مدلل مقدمے کی پیروی سنتا اور چالان کی کتاب ہاتھ میں پکڑے ہکا بکا تکتا رہ جاتا۔امی نے بھی اکثر کبھی مجھ سے کوئی بات منوانا ہوتی تو رخسانہ کو ہی کہتیں۔میں تمام عمر سمجھتا رہا کہ گھر میں میری چلتی ہے لیکن جب بھی گزشتہ زندگی اور معاملات کا جائزہ لیا تو یہی نتیجہ اخذ کیا کہ گھر میں بالآخر وہی ہوتا تھا جو میری رخسانہ چاہتی تھی۔۔۔کیسے؟ یہ مجھے ان مواقع پر تو کبھی سمجھ نہ آیا لیکن آج پتہ چلا کہ فقط اپنے دھیمے پن اور محبت سے وہ ہمیشہ فاتح رہتی تھی۔اسے میری شخصیت کی مضبوط فصیلوں کے کمزور حصوں کا بخوبی علم تھا اور اس کے خاموش حملے عموماً انہی دراڑوں پر ہوتے جو

بالآخر اس کی فتح پر منتج ہوتے۔

ہمارے دونوں کے بزرگ رفتہ رفتہ ہم سے رخصت ہو چکے تھے۔ میری امی جان، ابا جان اور رخسانہ کے والد یکے بعد دیگرے جہان فانی کو الوداع کہہ چکے تھے۔ صرف رخسانہ کی والدہ میری ممانی جان حیات تھیں اُن کی طبیعت بھی خاصی ناساز رہتی تھی۔ دل کے ساتھ ساتھ وہ بھی ذیابیطس کی پرانی مریضہ تھیں، نہایت نحیف اور نقاہت کا شکار۔ ہم ان کا خاص طور پر خیال رکھا کرتے تھے کیونکہ وہ اب تنہائی کو بھی شدت سے محسوس کرنے لگی تھیں۔ اکثر ہم انہیں اپنے پاس لے آتے یا پھر رخسانہ لاہور انکے پاس چلی جاتی۔ لیکن اسی دوران رخسانہ کی ہیپاٹائٹس رپورٹس زیادہ خراب آنے لگیں۔ اسپیشلسٹ ڈاکٹر نے ایک سال والے انجکشنوں کا کورس تجویز کیا۔ یہ ٹیکہ ہفتہ میں ایک لگنا تھا اور خاصا مہنگا تھا۔ رخسانہ کو علم ہوا تو اس نے اس مہنگے علاج سے انکار کر دیا مگر میرا اپنی ذات سے عہد تھا کہ چاہے خود کو بیچنا پڑے لیکن علاج ضرور کرواؤں گا۔ اللہ بہت رحیم و کریم اور کارساز ہے۔ اس نے جلد ہی سبب بنا دیا اور ہمیں علم ہوا کہ شہریار کو والدین کے علاج کی سہولت حاصل ہے۔ چنانچہ جو مہنگی سہولت مجھے ریٹائرڈ سپاہی ہونے کی بنا پر میسر نہ تھی وہ میرے بیٹے کو حاضر سروس ہونے کی وجہ سے مل سکتی تھی۔ تمام کاغذی کاروائیاں پوری کی گئیں۔ اور غالباً مارچ ۲۰۱۲ء میں رخسانہ کا ایک سال کے ٹیکوں والا کورس شروع ہوا۔ یہ انجکشن مقابلتاً زیادہ پر اثر لیکن سخت تھا۔ ٹیکہ لگوانے کے بعد تین روز تک رخسانہ غنودگی میں رہتی پھر دو روز بخار رہتا بمشکل ایک آدھ دن قدرے آرام کا سانس لیتی کہ اگلا ٹیکہ تیار ہوتا اور یہ سلسلہ اڑتالیس ہفتے چلنا تھا۔ لمحہ فکریہ یہ تھا کہ رخسانہ بیحد کمزور ہو چکی تھی اور اس کی صحت اتنے سخت انجکشن کی متحمل نہ ہو سکی تھی لیکن بقول ڈاکٹروں کے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ وہ اچھی خوراک پر زور دیتے اور اچھی خوراک ذیابیطس کا مژدہ سناتی۔ رخسانہ نے دو تین ماہ تو اس صوتحال کو برداشت کیا لیکن پھر اپنی آئی پر آ گئی۔ وہی گھر کے کام کاج اور وہی رخسانہ۔ ملازم ہونے کے باوجود وہ باز نہ آتی۔ اب تو اسکی اس ڈھٹائی پر میری

اس سے شدید جھڑپ بھی ہوجایا کرتی ۔ممانی جان کو بھی اپنی بیٹی کی بہت فکر رہتی ۔انکا دل چاہتا تھا کہ رخسانہ ان کے پاس زیادہ عرصہ رہے چنانچہ ڈاکٹر کی اجازت سے اس کے ایک ماہ کے انجکشن اکٹھے لیکر اسے لاہور بھیج دیا۔

اکتوبر میں ممانی جان کی صحت ناگہانی طور پر بگڑنے لگی ۔چند دنوں میں ہمت ہار کر بالآخر وہ خالق حقیقی سے جاملیں ۔ہم دونوں کے سروں سے تمام بزرگوں کا سایہ اُٹھ چکا تھا۔ایک ڈیڑھ ماہ بعد حالات ایسے بنے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں سرمد کا نکاح کرنا پڑا۔ممانی جان کی رحلت کا زخم تازہ تھا لیکن رخسانہ نے نہایت جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نکاح کے لئے ہامی بھرلی اور یوں دسمبر ۲۰۱۲ء میں سرمد کا نکاح بخیر وخوبی سرانجام پایا۔

سن ۲۰۱۲ء رخصت ہوا تو سال نو ۲۰۱۳ء ہمارے لئے پہلی خوشخبری رخسانہ کی صحت یابی کی لایا۔کورس مکمل ہونے پر ٹیسٹ کرایا تو پتہ چلا کہ رخسانہ کو ہیپاٹائٹس سی کے موذی مرض سے نجات مل چکی ہے ۔ہم سب کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی ۔خود رخسانہ کی مسرت اور اطمینان قابل دید تھا۔افسوس کے ہمارے دو بڑے یعنی میری امی اور رخسانہ کی امی حیات نہ تھیں جنہیں رخسانہ کی صحت یابی کا شدت سے انتظار تھا۔بہر حال یہی اللہ کی رضا تھی ۔اور یہ بھی رب کائنات کی ہی منشاء تھی کہ ہماری یہ خوشی محض عارضی ثابت ہو۔ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ اس کے معمول کے طبی چیک اپ کے دوران انکشاف ہوا کہ رخسانہ چھاتی کے سرطان میں مبتلا ہے۔ مجھے اس ڈاکٹر کی بات شدت سے یاد آئی جس نے مذاقاً کہا تھا کہ بہن آپ تو ڈھونڈھ کر بیماریاں خود پر طاری کرتی ہیں ۔گو کہ کینسر ابھی پہلی اسٹیج پر تھا لیکن ہمارے لئے یہ خبر کسی بم کے دھماکے سے کم نہ تھی ۔مجھے ایکبار پھر ایسا محسوس ہوا جیسے میرا چھوٹا سا گھروندہ کسی مہیب زلزلے کی لپیٹ میں آکر لرز رہا ہے ۔اپنے رب کریم سے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ اے اللہ میں گناہگار تو ہوں ہی لیکن کمزور بھی ہوں اور کمزور بھی ایسا کہ ان سخت اور کٹھن آزمائشوں کا متحمل ہونے سے یکسر عاری ۔میرے گھر کو سدا آباد رکھنا۔

مختلف ڈاکٹروں سے مشوروں کے بعد فیصلہ ہوا کہ رخسانہ کا آپریشن لاہور کے نہایت ماہر ڈاکٹروں سے کروایا جائے۔لاہور سے ازلی محبت رکھنے والی رخسانہ کا اپنا بھی یہی فیصلہ تھا کہ وہ لاہور چھوٹی بہن فرزانہ کے پاس رہ کر آپریشن کروائے گی۔رخسانہ کی خوشی میں میری خوشی تھی۔مئی ۲۰۱۳ء میں ہم دونوں لاہور گئے جہاں اس کا آپریشن ہوا۔مجھے وہ فخر،غرور اوراعزاز آج تک بھی نہیں ملا جواس وقت ملا جب آپریشن تھیٹر سے باہرآ کر ہوش میں آنے کے بعد رخسانہ نے وہاں موجودنرسوں سے پوچھا کہ سہیل کہاں ہیں؟ میں فوراً آئی سی یو میں گیا اورنیم وا آنکھوں سے خفیف مسکراہٹ بکھیرتی رخسانہ کی پیشانی پر بے اختیار اپنے ہونٹ ثبت کردیئے۔

آپریشن کے بعد بائیوپسی ٹیسٹ رپورٹ آنے پر رخسانہ کے لئے کیموتھراپی تجویز ہوئی چنانچہ اسکا لاہور میں قیام مزید وقت کیلئے بڑھ گیا۔اسی دوران شمعل جسے اس کی خالہ نے امریکہ کے لئے سپانسر کیا تھااس کا امریکہ جانے کا وقت آ گیا۔شمعل،نانی (رخسانہ) کوالوداع کہنے لاہور گیا لیکن وہ محبت کی ماری اس کے ساتھ کچھ دنوں کے لئے اسلام آباد آ گئی کہ وہ خودنواسے کوالوداع کرے گی۔کیموتھراپی مکمل ہونے تک رخسانہ بھی اب گھر سے دوری کومحسوس کرنے لگی تھی سو جب ریڈیوتھراپی کا وقت آیا تواس نے اسلام آباد سے کروانے کوترجیح دی۔ ۲۰۱۳ء کےآخرمیں اسلام آباد سے ریڈیوتھراپی ہوئی اورایک ماہ تک اسے روزانہ ہسپتال لانے لیجانے کی سعادت بڑی بیٹی نادیہ کو حاصل رہی۔یہ ایک اورآزمائش تھی جس کی تکلیف صرف رخسانہ ہی محسوس کرسکتی تھی۔ریڈیوتھراپی نے ، جسے بجلی لگانا بھی کہا جاتا ہے رخسانہ کی جلد جلا کر سیاہ کردی تھی۔

۱۷ردسمبر ۲۰۱۳ء کو ہماری شادی کی اڑتیسویں سالگرہ تھی۔ہم نے اکھٹے کیک کاٹا جو کہ ایک منفرد بات تھی۔ایک دوسرے کے منہ میں کیک کا ٹکڑا ڈالا اور میں نے رخسانہ کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔اس نے بھی مزاحمت نہ کی اوراپنا سر میرے سینے پر ٹکا دیا۔ہم نے

روزِ اول سے پیار کے عمومی اظہار کو ایسا عمل بنا رکھا تھا کہ بچوں کو نہ تو اچنبھا ہوتا اور نہ ہی وہ اسے کوئی غیر معمولی حرکت سمجھ کر دائیں بائیں منہ چھپاتے، بلکہ جب کبھی ہم اسطرح کا اظہار کرتے تو ان سب کی خوشی دیکھنے والی ہوتی۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا جو اس وقت تو محسوس نہ کیا مگر بعد میں جانا کہ وہ آخری سالگرہ تھی جو ہم نے اکھٹے منائی۔ اس سے چند ہی روز پہلے رخسانہ کی اپنی اٹھاونویں سالگرہ گزری تھی جس پر میں نے اسے ایک خوبصورت سرمئی رنگ کا اونی کوٹ تحفہ میں دیا اور جسے اس نے حسب عادت کسی تقریب میں پہننے کے ارادے کے ساتھ سنبھال کر رکھ دیا مگر پہننے کی نوبت نہ آئی۔ انہی دنوں نجانے کہاں سے اچانک اسے سرمد کی شادی جلد از جلد نمٹانے کی سوجھی میں نے نرم الفاظ میں احتجاج کیا تو کہنے لگی،

''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ لوگوں نے دیر کی تو شاید نہ دیکھ سکوں''۔

میں بات مذاق میں ٹالتے ہوئے کہا،''لو جی، تمام بیماریوں سے تو تم چیمپئن بن کر سرخرو ہوئی ہو۔ اب تو تمہارے اچھے دن آنے والے ہیں، ان شأ اللہ۔ مایوسی کی باتیں نہیں کرتے یہ بہت بری بات ہے''۔

کہنے لگی،'' میں اندر سے ختم ہو چکی ہوں بس آپ لوگوں کو چلتی پھرتی نظر آتی ہوں۔''

''تو میری جان تم آرام کیوں نہیں کرتیں؟ اس حالت میں بھی گھرداری اور بچوں کی خدمت خاطر سے باز نہیں آتیں؟''، میں نے سوال کیا۔

ایک ٹھنڈا سانس لے کر بولی،''زندہ ہوں تو خاطر کر دیتی ہوں، نہیں ہونگی تو سب یاد کرنا''۔

میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔ کتنی بڑی بات کتنے آرام سے کہہ دی تھی اس نے۔ چند سیکنڈ کیلئے وہ سارا منظر میری نگاہوں کے سامنے رکھ گئی جس سے میں جلد گذرنے والا تھا۔ میں نے گال تھپتھپائے اور کہا کہ وہ مایوسی کی باتیں نہ کرے۔ اس کی خواہش پر اپریل ۲۰۱۴ء

میں سرمد کی شادی رکھی گئی جو بخیر و خوبی انجام پائی۔ کیموتھراپی کے بعد رخسانہ کے سر کے بال ختم ہو چکے تھے اور اب دوبارہ گھنے اور نہایت چمکدار بال واپس آ رہے تھے۔ دیکھنے میں لگتا تھا جیسے بوائے کٹ کرایا ہو۔ رنگت بھی قدرے نکھر گئی تھی۔ اور ایک عجیب سا روپ اس کے چہرے پر سجا تھا۔ میں نے پیار سے کہنا شروع کر دیا کہ تم تو میری ڈیمی مُور (Demi Moore) لگتی ہو۔ وہ میرے دیئے ہوئے اس لقب کو خوب انجوائے کرتی۔ سن ۲۰۱۴ء کا رمضان المبارک آیا تو رخسانہ بی بی نے نادر شاہی فرمان جاری کیا کہ وہ اس سال روزے رکھے گی۔ سب نے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے ہیپا ٹائٹس سی، ذیابیطس، تازہ سرجری، کیموتھراپی غرضیکہ کسی بھی چیز کی پروانہ کی۔ بالآخر، حسب معمول سب کو اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ نادیہ اور نئی بہو سائرہ دونوں ماں کا بیحد خیال رکھتی تھیں لیکن اس کی تو بھوک ہی ختم ہو چکی تھی سو نہایت عامیانہ سی خوراک کے ساتھ روزہ رکھتی اور افطاری کرتی۔ ہم وقتاً فوقتاً روزہ چھوڑنے کا کہتے تو کہتی کہ پتہ نہیں اگلے سال نصیب ہونگے یا نہیں سو اسے مت روکا جائے۔ اسی دوران میری سالگرہ آئی۔ حیرت انگیز طور پر رخسانہ کو نہ صرف میری سالگرہ کا دن یاد رہا بلکہ سرمد سائرہ کے ساتھ خود بازار جا کر میرے لئے خوبصورت سبز رنگ کی پولو ٹی شرٹ خرید کر لائی اور اصرار کیا کہ میں وہ ٹی شرٹ پہن کر کیک کاٹوں اور تصویر کھنچواؤں۔ وہ کسی خواہش کا اظہار بہت کم کرتی تھی اور میں بھی اس کی خواہش کو حتیٰ الامکان رد نہیں کیا کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہمیں تو ساتھ چلنا تھا

رخسانہ، نادیہ اور سائرہ کی قربت میں بیحد خوش رہتی تھی۔ چونکہ دونوں ڈرائیونگ جانتی ہیں سو اکثر شام کو فرمائش کر کے دونوں میں سے کسی ایک کو لیکر مارگلہ روڈ یا اسلام آباد کے کسی بھی پر رونق تجارتی مرکز کا چکر لگانے ضرور نکلتی۔ میں اگر کبھی اپنی خدمات پیش کرتا کہ آؤ میں سیر کرالاتا ہوں تو نہایت لاڈ سے پنجابی میں کہتی، ''وے بابیا! ساری عمر تیرے نال ای تے سیراں کیتیاں نیں، ہُن آرام نال بیہہ جا'' (وے بابا! ساری عمر تمہارے ساتھ ہی تو سیریں کی ہیں اب تو آرام سے بیٹھ جاؤ) اور ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔

عمران خان کا دھرنا اپنے عروج پر تھا۔ اکثر نادیہ یا سرمد کو کہتی کہ وہ اسے دھرنے پر لے چلیں، اسے عمران کی تقریر سننا ہے۔ ایک روز ان لوگوں نے اسکی خواہش پوری بھی کر دی۔ ۱۴ راگست ۲۰۱۴ء کا یوم آزادی بھی اس نے بچوں کیساتھ سڑکوں پر منایا۔ اسے خوش دیکھ کر میرا دل بھی خوش ہوتا لیکن اندر ہی اندر میرا دل بیٹھ رہا تھا۔ ہیپاٹائٹس اور کینسر کے شدید اور تکلیف دہ علاج نے اور وہ بھی یکے بعد دیگرے، اسکے اندر ایک الاؤ بھڑکا یا ہوا تھا۔ وہ اندر سے کھوکھلی ہو کر رہ چکی تھی۔ اسکا بس چلتا تو وہ برف کی سل پر بیٹھتی۔ میں نے اسکے لئے کبھی ائر کنڈیشن بند نہیں کیا تھا لیکن اسے میرے حالات کا بیحد احساس تھا۔ اکثر کہتی بجلی کا بل زیادہ آئیگا، ہمیں اے سی کم چلانا چاہیے۔

اگست ۲۰۱۴ء کے تیسرے ہفتے میں جسم کی گرمی سے نڈھال ایک روز وہ غُسل کر کے نکلی تو شدید کھانسی کا دورہ پڑا اور اسی لمحے سانس کی تکلیف بھی شروع ہوگئی۔ ڈاکٹروں نے ہمیں نہایت سختی سے رخسانہ کو وبائی اور چھوت والی بیماریوں سے دور رکھنے کا کہا تھا لیکن بدقسمتی سے اس وقت پورے اسلام آباد میں کھانسی اور گلے کی شدید بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ خود گھر میں ایک آدھ فرد کو چھوڑ کر سب صاحبِ فراش تھے۔ ہماری حتیٰ الوسع کوشش ہوتی کہ وہ سب سے الگ تھلگ رہے اور مجبوری میں سامنا کرنا بھی ہو تو طبی ماسک پہن کر سامنے آئے۔ کھانسی کے تازہ حملہ کے بعد ہمیں شدید فکر لاحق ہوئی۔ درمیان میں ایک آدھ دفعہ ہسپتال بھی لیجانا پڑا، دوا بھی بدلی لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ماہ اگست کی آخری تاریخیں تھیں جب بڑی بیٹی نادیہ اسے ہسپتال لیکر گئی اور ڈاکٹروں سے شکایت کی کہ علاج کے باوجود کھانسی کیوں ٹھیک نہیں ہو رہی؟ ہسپتال والوں نے گذشتہ بیماریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اُسے فوراً ہسپتال داخل کرانے کا مشورہ دیا لیکن رخسانہ وہاں سے کپڑے اور سامان لانے کا بہانہ بنا کر واپس آ گئی۔ میں نے قدرے درشتی سے بھاگ آنے کی وجہ پوچھی تو معصومیت سے بولی، ''اکتیس اگست کو سائرہ (بہو) کی سالگرہ ہے۔ دو ہی دن کی تو بات ہے پھر چلی جاؤں گی۔

ہماری شروع سے ایک عادت تھی کہ رات سونے سے پہلے دیر تک باتیں کرتے جس میں خاندانی حالات، بچوں کے معاملات، ملنے جلنے والوں کی کہانیاں سب گپ شپ شامل ہوتی۔ یہ غالباً ۳۰ راگست کی شب تھی۔ میں بستر پر لیپ ٹاپ آغوش میں رکھے کوئی کالم لکھنے میں مصروف تھا اور رخسانہ پائنتی کی طرف تکیہ رکھے باتیں کرتی کرتی سوگئی۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں مجھے رخسانہ کے چہرے پر تکلیف اور تھکن کی شدت کے آثار واضح نظر آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ نجانے کتنا لمبا سفر طے کر کے آئی ہو۔ اچانک میں کام چھوڑ کر اسکے چہرے کو غور سے تکنے لگ گیا۔ نہیں معلوم کہ میرے دل پر کیسی کیفیت طاری ہوئی یا میرے ذہن نے کیا سوچا کہ اچانک میری آنکھوں سے آنسوؤں کی شدید جھڑی جاری ہوگئی۔ میں نے سسکیاں

اپنے ہونٹوں میں بھینچ لیں مبادا وہ بیدار نہ ہو جائے لیکن نہایت کچی نیند کی مالک رخسانہ میری دبی سسکیوں سے بھی جاگ گئی اور گھبرا کر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے فوراً آنسو پونچھنے کی کوشش کی تو وہ بولی،

''سُہیل! خیریت تو ہے ناں؟ میری جان کیا ہوا ہے''؟

میری خاموشی دیکھ کر خود ہی بات آگے بڑھائی، ''امی جان یاد آ رہی ہیں کیا''؟ اسے علم تھا کہ میں امی کو بہت یاد کیا کرتا ہوں۔ مجھے بہانہ چاہیئے تھا فوراً اثبات میں سر ہلا ڈالا۔ اس نے اپنی تکلیف نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ کر مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا اور تسلی دینے لگی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اس کے کاندھے پر سر رکھا تھا اور پھر ایسا لگا جیسے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے ہوں۔ میں پھوٹ پھوٹ کر اور دل کھول کر رویا۔ ان آنسوؤں اور سسکیوں میں رخسانہ کو کھونے کا خوف اور ربِّ کائنات سے اپنی رفیقِ زندگی کی صحت کیلئے دعا بھی تھی۔ میں دل کا بوجھ ہلکا کر رہا تھا اور وہ معصوم بے خبر میرا سر سہلاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ شاید میں ماں کو یاد کر رہا ہوں۔

اکتیس اگست کو سائرہ کی سالگرہ کے بعد بھی وہ ہسپتال جانے سے انکار کرتی رہی۔
دوپہر کو ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ نجانے کہاں سے اچانک بے موقع بات چھیڑ دی،

''سُہیل! میری دعا ہے کہ مجھے موت آپکے ہاتھوں میں آئے۔ وعدہ کریں کہ مجھے کفن آپ اپنی کمائی کا پہنائیں گے''۔

اکثر کہا کرتی تھی کہ عورت کو لباس اور کفن شوہر کی کمائی کا ہی جچتا ہے۔ میں لرز کر رہ گیا اور بولا، ''چھاناں! ہوش کے ناخن لو۔ یہ بھلا کوئی وقت ہے ایسی باتوں کا؟ تم تو بیحد بہادر عورت ہو۔ میں نے زندگی بھر تمہاری بہادری اور استقامت کو دیکھ کر ہمت پکڑی ہے۔ اگر تم ایسی باتیں کرو گی تو میں تو فوراً ڈھیر ہو جاؤں گا''۔

بولی، ''پتہ نہیں کیوں مجھے ڈر لگنے لگا ہے''۔

میں نے ہمت بندھانے کی کوشش کی، ''حوصلہ کرو میری جان۔ تمام خطرناک بیماریوں سے تو تم گذر آئی ہو۔ اللہ نے شفا بھی عطا کر دی ہے۔ اب معمولی کھانسی رہ گئی ہے، کل صبح ان شاءاللہ ہسپتال داخل ہو جاؤ گی تو وہ بھی ٹھیک ہو جائیگی''۔

ہلکی سی مسکراہٹ سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر شکائتی انداز میں بولی،

''باباجی آپ مجھے ہسپتال تو بھیج رہے ہو لیکن نجانے مجھے کیوں یہ خدشہ لاحق ہے کہ میں زندہ واپس نہیں آؤنگی''۔

میں نے اپنائیت سے اپنا ہاتھ اسکے منہ پر رکھتے ہوئے پیار سے کہا،

''بکواس نہیں کرتے''۔

یکم ستمبر کو ہم دونوں حسبِ معمول صبح نمازِ فجر کیلئے اٹھے۔ تلاوت کے بعد تھوڑی گپ شپ ہوئی تو کہنے لگی میرا چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔ میں نے بچوں کو جگانا مناسب خیال نہ کیا اور خود چائے بنا کر ساتھ کیک رس لیکر آیا۔ دونوں چائے کی چسکیوں کیساتھ باتوں میں مشغول ہو گئے۔ اس نے حیران کن طور پر بچوں کی باتوں کے بجائے ماضی کے دریچوں سے پردے وا کرنے شروع کر دیئے۔ اپنے امی ابا، میرے والدین، اپنے مرحوم بھائیوں کے ساتھ ساتھ دیگر مرحوم عزیزوں کا تذکرہ اسکی گفتگو کا محور تھا۔

اسکا آج بہر صورت ہسپتال جانے کا وعدہ تھا۔ ہسپتال جانے سے قبل کچھ دیر نیند کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں روشنی گل کر کے کمرے سے نکل آیا۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے دن تک خوب نیند کر کے اٹھی تو میں نے تیار ہونے کا کہا۔ بولی وہ میرے نہیں بلکہ سائرہ کے ساتھ جائے گی۔ میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ قدرت مجھے اپنے ہاتھوں سے اسے رخصت کرنے کا کہہ رہی تھی لیکن کسی بھی بات سے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ہمیشہ کیلئے جا رہی ہے۔ ائرفورس کے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ شام کو ہم سب ملنے گئے تو سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ علاج بھی سنجیدگی سے ہو رہا تھا اور ہمیں بھی بہتری کے آثار نظر آ رہے

تھے۔فضائیہ کے ایک بہت سنیئر افسر ایئر مارشل جمشید اور انکی اہلیہ سے بہن بھائیوں جیسے تعلقات تھے جو رخسانہ کی بڑی بہنوں جیسی عزت کرتے تھے۔انہیں علم ہوا تو انہوں نے رخسانہ کو وی آئی پی روم میں منتقل کرایا اور ڈاکٹروں کو خصوصی توجہ کی ہدایت کی۔وہ بھائی کے اس عمل سے بیحد خوشی اور فخر محسوس کر رہی تھی اور ہر آنے جانے والے سے تذکرہ بھی۔

چوتھے روز اچانک رخسانہ کی طبیعت بگڑنا شروع ہوگئی۔ڈاکٹروں نے اسے فوراً انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں منتقل کر دیا۔ایسے میں ہماری تشویش میں اضافہ ایک لازمی امر تھا۔ڈاکٹر بھی ہمیں کچھ نہیں بتا رہے تھے۔بس اتنا کہتے تھے کہ علاج ہو رہا ہے اور وہ اپنے تئیں پوری کوشش کر رہے ہیں۔ہمیں تسلی تھی کہ جمشید ڈاکٹروں سے رابطے میں ہیں اور باقاعدہ رپورٹ لے رہے ہیں۔پانچ ستمبر کی شام ہسپتال والوں نے رخسانہ کو آکسیجن لگا دی کیونکہ سانس لینے کی دشواری میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ایسے میں ایک روز طبیعت ذرا بحال ہوئی اور آکسیجن اتری تو ایک بات کی،''عمران خان کے دھرنے کا کیا بنا؟ اللہ اسے کامیاب کرے''۔ہم سب نے کہا کہ وہ دھرنے کی فکر نہ کرے اور اپنی صحت کی طرف توجہ دے۔چھ تاریخ تک رخسانہ سے بولنا بیحد مشکل ہو گیا تھا ایسے میں اس نے صرف ایک پرچی لکھی، جسے میں جب بھی نکال کر پڑھتا ہوں میری آنکھوں کے سامنے میری محبت کا آخر لمحات کا مایوس چہرہ آجاتا ہے:

''ڈاکٹر کو بتانا ہے کہ رات بہت خراب گذری۔
اور یہ کہ آکسیجن کے بغیر سانس نہیں آ رہا تھا۔
اور اب بھی یہ حالت ہے کہ دھڑکن بہت تیز ہے''۔

اسکی حالت بہت تیزی سے بگڑ رہی تھی اور اب تو ڈاکٹر بھی خاصے فکرمند تھے۔سات ستمبر کی دوپہر کو ایک اسپیشلسٹ آیا اور کہنے لگا کہ اس حالت میں یہ زیادہ دیر نہیں رہ سکتیں، انہیں خطرہ مول لے کر راولپنڈی، افواجِ پاکستان کے شعبہ قلب میں فوری طور پر منتقل

کرنا ہوگا۔ایسی حالت کے لئے خصوصی ایمبولینس کا بندوبست کیا گیا اور رخسانہ مغرب کے وقت تک ملٹری ہوسپٹل کے اے ایف آئی سی میں منتقل ہو چکی تھی۔انتہائی نگہداشت والوں نے پھیپھڑوں کے خصوصی معالج کو بلایا تو اس نے انکشاف کیا کہ ایک پھیپھڑا بالکل ناکارہ ہو چکا تھا جبکہ دوسرا بھی شدید متاثر تھا۔امید کی ایک کرن صرف اس لئے نظر آتی تھی کہ باقی اعضاً تاوقت درست کام کرر ہے تھے۔

رخسانہ کے ہسپتال میں داخل ہوتے ہی ہم نے فرزانہ کو اطلاع کر دی تھی جو اسلام آباد پہنچ کر اس کے ساتھ تھی۔سات ستمبر ہی کی شام کو میں دوبارہ رخسانہ کو ملنے گیا تو وہ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔اس مختصر سی ملاقات میں میں نے اسے حوصلہ دلایا کہ وہ جلد ٹھیک ہو جائیگی،اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

یہ ہوش میں رخسانہ کی مجھ سے آخری اور نہایت مختصر ملاقات تھی۔

ہم میں سے کسی نہ کسی کو ہمہ وقت ہسپتال میں موجود ہونا ہوتا تھا اور اسلام آباد سے یہ فرض انجام دینا خاصا مشکل تھا۔چونکہ شہر یار کو سرکاری رہائشگاہ ملی ہوئی تھی سو میں نے فیصلہ کیا کہ ہم سب بڑے بیٹے شہر یار کے پاس چکلالہ منتقل ہو جائیں جہاں سے ہسپتال نزدیک تھا چنانچہ ہم سب اسی روز شہر یار کے پاس منتقل ہو گئے۔

آٹھ ستمبر کو ڈاکٹر نے طبی معائنہ کے بعد کہا کہ طبیعت بگڑ رہی ہے اور وینٹی لیٹر پر ڈالنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں، گو کہ اس میں بھی امید نصف ہی تھی۔ہمارے لئے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ادھر امریکہ میں جویریہ ماں کی بیماری پر بے کل اور پریشان تھی۔ہم ابتک تو اس سے جھوٹ بولتے چلے آر ہے تھے لیکن اس شام جب رخسانہ کو وینٹی لیٹر پر ڈالا گیا تو نادیہ نے مشورہ دیا کہ اسے اطلاع دے ہی دی جائے ورنہ ساری عمر کا پچھتاوا رہے گا۔میں اگر جویریہ کو اطلاع دینے میں ہچکچا رہا تھا تو فقط اس لئے کہ امریکہ سے روز روز آنا کوئی مذاق نہیں ہے اور وہ ابھی کچھ ہی دیر قبل پاکستان سے ہو کر گئی تھی۔اسی شام دل کڑا کر کے اُسے اطلاع

دیدی گئی اور رات سُہیل (میرے داماد) نے ہمیں جویریہ اور ریان کی روانگی بارے مطلع کر دیا۔

نو ستمبر کا دن بھی اسی اتار چڑھاؤ میں گذرا۔ اگر کوئی نئی خبر ملتی بھی تو یہی کہ اب فلاں عضو نے کام چھوڑ دیا ہے اور اب فلاں نے۔ اسی سہم کے ساتھ دس ستمبر، سرمد کی سالگرہ کا دن طلوع ہوا۔ صبح کاذب کے وقت جویریہ جسے ہم سب پیار سے بیلا کہتے ہیں اسلام آباد پہنچی تو شہریار اسے ائرپورٹ سے سیدھا ہسپتال لیکر چلا گیا۔

بیلا نے ماں کے کان میں آواز دی، ''امی! میں آ گئی ہوں''۔

رخسانہ نے وینٹی لیٹر پر ہونے کے باوجود سر کے خفیف اشارے سے ہاں کہا۔

صبح فجر کی نماز کے بعد میں لیٹا اور آنکھ لگی ہی تھی کہ تقریباً نو بجے کے قریب سرمد نے مجھے آہستگی سے بیدار کیا اور شہریار کا پیغام دیا کہ وہ ہسپتال بلا رہے ہیں، امی کی حالت بگڑ رہی ہے۔ انتہائی گھبراہٹ میں ہسپتال دوڑا تو وہاں نادیہ اور شیری (شہریار) نے بتایا کہ دونوں پھیپھڑوں نے کام چھوڑ دیا ہے اور اب تو دل بھی دھیرے دھیرے تھکاوٹ کا اظہار کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو شاید بچوں کی دل شکنی منظور نہیں تھی سو تسلی دینے کو صرف اتنا کہا کہ زندگی کی فقط پانچ فیصد امید ہے لیکن آپ لوگ دعا کریں کہ دعا کوئی بھی معجزہ دکھا سکتی ہے۔ آج سرمد کا جنم دن تھا۔ میں آئی سی یو میں رخسانہ کے سرہانے گیا تو سرمد کو اسکے سرہانے کھڑے ٹپ ٹپ آنسو بہاتے پایا۔ میں قدرت کی ستم ظریفی پر بھونچکا تھا کہ آج سے اٹھائیس برس قبل وہ ننھے سرمد کو اس دنیا میں لانے کیلیئے زندگی کی بقاؑ کی جنگ لڑ رہی تھی اور آج کے دن ایک دفعہ پھر اس بقاؑ کیلیئے فرشتہ اجل سے نبرد آزما تھی۔ معصوم رخسانہ بالکل سفید چہرہ لئے، فرشتوں کی سی معصومیت کے ساتھ میرے سامنے ساکت و جامد پڑی تھی البتہ ہلکی ہلکی نبض چلنے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے نمناک آنکھوں سے سرمد سے التجا کی کہ وہ مجھے اپنے فون سے رخسانہ کی ایک تصویر بنا دے۔

سرمد نے جواب دیا، ''ابو مجھ سے یہ کام نہیں ہوگا'' اور سسکیاں بھرتے ہوئے مجھے

فون پکڑا کر باہر نکل گیا۔

آپ سچ جاننا چاہتے ہیں تو سنیئے کہ مجھے اب یقین ہو گیا تھا کی رخسانہ کی وِداعی ٹھہر چکی تھی اور مشیت ایزدی اسکی آزادی کا پروانہ جاری کر چکی تھی۔ بس اب وہ کسی گھڑی کی مہمان تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ میں اسکے آخری لمحات کو کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے اسکی تصویر بنائی اور پھر یکلخت میری آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ میں کمرے میں بالکل اکیلا تھا اور بے اختیار دل چاہا کہ یہ موقع ضائع نہ کروں اور رخسانہ خواہ سنے یا نہ سنے میں اس سے ہر وہ بات کہہ ڈالوں جو آج تک نہ کہہ سکا تھا۔ اسکے سوئیوں سے چھِدے ہاتھ چادر سے باہر تھے اور ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ نہایت آہستگی سے اسکے دائیں ہاتھ کے نیچے سرکا دیا اور اپنی دل کی بات کہنی شروع کر دی۔

''رخسانہ! میری زندگی، میری جان! میرے ساتھ ایسا ظلم مت کرنا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جانا۔ میں جانتا ہوں کہ میری ساری زندگی آزمائشوں میں گذری ہے اور میں تمہیں وہ خوشیاں وہ آرام نہیں دے سکا جس کی تم حقدار تھیں۔ تم نے زندگی کی ہر اونچ نیچ میں میرا ساتھ دیا ہے اور میں تمام زندگی تمہارا مقروض رہا ہوں۔ تم نے میرے گھر کو ایک مثالی گھر بنا کر دکھایا۔ تم میرے بچوں کی ماں نہیں دوست تھیں۔ زندگی کے کسی بھی امتحان میں، میں نے ہمیشہ تمہارا نرم و گداز اور محبت بھرا ہاتھ اپنے کاندھے پر محسوس کیا۔ چھاناں! میرے ساتھ یہ ظلم مت کرنا، میں بکھر کر رہ جاؤں گا، میں تمہارے ساتھ زیادتیاں بھی کرتا رہا ہوں، ناراض بھی ہوتا رہا ہوں لیکن وہ سب میری محبت میری چاہت کی انتہا تھی۔ خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو۔ مجھے چھوڑ کر نہ جانا''۔

اچانک میں نے اُس کے ہاتھ میں ارتعاش محسوس کیا اور میں چونک کر رہ گیا۔ اپنی ڈبڈبائی آنکھیں صاف کر کے دیکھا تو وہ اپنا بایاں ہاتھ بصد دِقت دائیں ہاتھ کے قریب کر کے

بیحد کمزور اور نحیف گرفت کے ساتھ میرے ہاتھ کے پنجے کو تھامے ہوئے تھی! میں نے دل میں سوچا کہ یا اللہ! میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ کمرے سے باہر نظر دوڑائی تو نرسنگ اسٹاف اپنے معمولات میں مشغول تھا۔ انکے لئے ایسے دلگداز واقعات روز کا معمول تھے۔ میں نے بھی اپنا دوسرا ہاتھ بڑھایا اور اپنی جیون ساتھی کے دونوں ہاتھ قدرے مضبوط لیکن محبت بھری گرفت سے اپنے ہاتھوں میں لیکر جھکا اور اسکے یخ بستہ ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا،

''رخسانہ! تم سن رہی ہو تو للہ مجھے معاف کر دینا۔ بس جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ اور آکر اپنا گھر سنبھالو، مجھ کمزور سے یہ گھر نہیں سنبھالا جائیگا''۔

دل اسکی واپسی کی تمنا لئے ہوئے تھا اور دماغ میری سادہ لوحی پر طنزیہ ہنسی ہنس رہا تھا۔

میں نے اس روز بہت زیادہ وقت رخسانہ کے پاس گذارہ اور میں گذارنا چاہ رہا تھا۔ سہ پہر کے وقت اسکی نبضیں ڈوبنی شروع ہو گئیں۔ میری رُخسانہ ہسپتال کے بستر پر اپنی آخری سانسیں گن رہی تھی اور میں اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ بخوبی جانتا تھا کہ ہماری ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا لیکن کسی سے بھی کہنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ ایسے میں ایک خیال بے اختیار ذہن میں اُبھرا، ''وہ جس نے ساتھ دینا تھا لو تنہا کر گئی مجھ کو'' اور نقش ہو کر رہ گیا۔

میں آج اس بات کا اعتراف کر رہا ہوں کہ اس وقت میرے ذہن میں اچانک خیال آیا رخسانہ اپنی صحت، زندگی اور محبت غرضیکہ سب کچھ مجھ پر اور میرے بچوں پر قربان کر کے ہمیں ایسا مقروض کر کے جا رہی ہے کہ شاید ہم میں سے کوئی بھی کبھی بھی یہ قرض ادا نہ کر سکے۔ میں اور کچھ کر سکوں یا نہ کر سکوں لیکن اسکی یادوں کو اُسکی شخصیت کو ہمیشہ کیلئے امر تو کر سکتا ہوں۔ اتنے میں شہر یار وارڈ میں داخل ہوا اور بولا،

''ابو آپ تھک گئے ہیں، ویسے بھی سب لوگوں کا یہاں موجود ہونا بے فائدہ ہے۔ گھر جا کر قرآنِ پاک پڑھیں اور تھوڑا آرام کر لیں پھر شام کو آجایئے گا''۔ ہم سب ایک

دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے اور نجانے کیوں میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اب رات کو میں رخسانہ کو رخصت کرنے ہی آؤں گا۔ اسی صبح راحیلہ بھی لاہور سے پہنچ چکی تھی۔ مغرب کے وقت فرزانہ، نادیہ اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی گھر چلے گئے۔ گھر جا کر میں نے اپنے نواسے وہاج سے کہا کہ وہ میرا سارا سامان میری گاڑی میں رکھ دے۔ سچ پوچھیں تو رّبِ کائنات نے مجھے اشارہ دے دیا تھا کہ تم دونوں کے بندھن کا وقت پورا ہو چکا اور میں اپنی امانت واپس لے رہا ہوں۔ میں واش روم میں وضو کر رہا تھا کہ دروازے کے باہر کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ باہر نکلا تو سامنے نادیہ آنکھوں میں آنسو لئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی،

''چلی گئی ہیں ابو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہسپتال چلیں''

''چلی گئی؟ رخسانہ واقعی چلی گئی''؟ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ بہت دنوں سے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ نجانے کس وقت اچانک یہ خبر سننے کو ملے اور جب خبر ملی تو میں گویا سکتے میں آ گیا۔ ہسپتال پہنچنے تک شہر یار تمام کاغذی کارروائیاں پوری کر چکا تھا۔ آئی سی یو میں گیا تو اُنسٹھ سال کی خاردار مسافت طے کرنے کے بعد اور اپنی بقاؑ کی جنگ لڑتے لڑتے تھک ہار کر میری رخسانہ چہرے پر ابدی سکون سجائے، گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے پیشانی اور گالوں پر بوسے لئے اور اسے گھر لے آئے۔ وہ بڑے بوڑھوں کی بات کو سچ ثابت کر رہی تھی کہ

''ڈولی میں آئی ہوں تو یہاں سے ڈولے میں ہی جاؤں گی''۔

آج چھوٹے اور لاڈلے بیٹے سرمد کو اسکی سالگرہ پر اس نے اسے اپنی زندگی کا تحفہ دیا تھا۔ اگلے روز بڑے سپوت شہر یار کی سالگرہ تھی۔ رخسانہ نے اسے بھی مایوس نہیں کیا اور اعزاز بخشا کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں لحد میں اتارے۔

گھر میں جنازہ اٹھانے سے پہلے داناں، فرزانہ اور راحیلہ مجھے لاؤنج میں بلا کر لائیں کہ بھائیجان! آ کر باجی سے مل لیں، وہ جا رہی ہیں۔ خواتین کے رش میں میں اسکے سرہانے پہنچا تو حسن کے مجسمے کو نہایت خفیف مسکراہٹ لئے محوِ خواب پایا۔ یہ وہی مسکراہٹ تھی

جو پہلی ملاقات میں میرا دل لے گئی تھی۔ میں اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ آج وہ اسی مسکراہٹ کو اپنے ساتھ لئے مجھے قلاش کر کے جا رہی تھی۔ میں سب سے بے نیاز آگے بڑھا۔ اسکی پیشانی چوم کر پائینتی کی جانب جا کر بیٹھ گیا۔ اسکے دونوں پاؤں اپنے ہاتھوں میں تھامے اور انہیں بوسہ دیا۔ یہ وہ عظیم عورت تھی جس نے الطاف پرواز اور نسیم الطاف کی قابلِ فخر بہو ہونے کا ثبوت دینے کے ساتھ ساتھ سُہیل پرواز کے گھر کو نہ صرف چار چاند لگائے بلکہ اس گلشن کو مثالی جنت بنا کر دکھایا۔ آج وہ بیگانوں کیطرح ایسے رخصت ہو رہی تھی جیسے ہمیں جانتی تک نہ ہو۔ میری جیون ساتھی اور میرے بچوں کی ماں رخسانہ کی اور میری رفاقت کم و بیش انتالیس سال رہی۔ میری آزمائشوں، پریشانیوں اور تفکرات میں اسکا وجود میرے لئے اللہ کریم کا عطا کردہ بیش قیمت سہارا تھا اور آج وہ سہارا مجھ سے چھن گیا تھا۔

☆

اس وقت موسم میں شدید گھٹن ہے۔ کچھ ماہِ ستمبر کی وجہ سے اور شاید کچھ رات کے ہولناک حادثے کیوجہ سے۔ اچانک مجھے اپنے کاندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ میں جیسے چونک گیا۔ خیالات کا سلسلہ یکلخت منتشر ہو گیا۔

نہیں یہ رخسانہ نہیں ہو سکتی۔ وہ تو نہ آنے کیلئے چلی گئی تھی۔

یہ شہریار اور سرمد تھے جو میری یادوں میں مخل ہوئے تھے،

''ابو گھر چلیں، بہت دیر ہو گئی ہے''۔

گھر؟ کونسے گھر؟ میرے آشیانے کے تنکے تو بکھر چکے۔ آس پاس نظر دوڑائی تو بہت سے لوگ تدفین کے بعد جا چکے تھے۔ جو چند عزیز احباب موجود تھے انہیں میری اجازت درکار تھی۔ کیا واقعی انہیں میری اجازت کی ضرورت تھی؟ اگر ایسا تھا تو پھر رخسانہ نے مجھ سے کیوں اجازت طلب نہیں کی؟ مجھے اس سوال کا جواب شاید کبھی نہ ملے۔

میں لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر نہایت محبت سے رخسانہ کی تربت پر ہاتھ

پھیرا، اسے الوداع کہا اور دل ہی دل میں شعر کو مکمل کیا۔

فسردہ کر گئی مجھ کو، شکستہ کر گئی مجھ کو
کہ جس نے ساتھ دینا تھا، وہ تنہا کر گئی مجھ کو

دل میں خیال آیا کہ بچوں کی ضد ہے کہ گھر چلوں۔۔۔۔۔۔لیکن کونسے گھر؟ جسے میرے ساتھ گھر چلنا تھا وہ تو بنا بتائے ابدی سکونت کیلئے سدھار گئی۔ ہاں اب ہم سب اس گھر کو روانگی کیلئے اپنی اپنی باری کے منتظر ہیں۔

بچوں کی ممتا رخصت ہوگئی لیکن ماں زندہ رہے گی۔
میری رخسانہ رخصت ہوئی لیکن محبت امر رہے گی۔
ان شاٗاللہ

الوداع رخسانہ، الوداع!

ہمیں تو ساتھ چلنا تھا، ہمیں وعدہ نبھانا تھا
جھٹک کر وہ قبائے جاں، دریدہ کر گئی مجھ کو

☆ ☆ ☆

تمام شُد

۱۶/اگست ۲۰۱۶ء

اسلام آباد، شام سات بجے

آرأ

سُہیل پروآز ایک خوش فکر، کثیرالجہات، زود گو اور فہم آشنا لکھاری ہیں۔ اپنے خاندانی پس منظر میں سُہیل علمی وادبی اور صحافتی سطح پر ایک مضبوط حوالہ رکھتے ہیں۔ اُن کے والدِ محترم جناب الطاف پروآز کا شمار ملک کے راست فکر، محبِّ وطن اور تعلیم یافتہ نابغوں میں ہوتا ہے۔ الطاف پروآز صاحب کی حب الوطنی، اُن کی تحریروں میں پاکستانیت کا مصمّم جذبہ اور صوفیاء سے اُن کی قلمی و قلبی وابستگی اظہر من الشّمس ہے۔ وراثت میں ملنے والے یہ خاندانی اقدار و اطوار سہیلؔ پرواز کے قلب و قلم پر بھی سایہ فگن رہے ہیں جس پر وہ بجاطور پر فخر کر سکتے ہیں۔

سہیل پروآز نے اظہار کے مختلف میدانوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ اُن کی تازہ زیرِ مطالعہ کتاب ''جو تنہا کر گئی مجھ کو'' اُن کے قلمی سفر کے حوالے سے ایک اہم، تجرباتی اور کئی شیڈز رکھنے والی کتاب ہے۔ چودہ ابواب میں منقسم، سہیل کی اس مختصر آپ بیتی میں آخری باب ''ہمیں تو ساتھ چلنا تھا'' اِس کتاب کا بند ہوتا ہوا اور پھر ایک اور سمت میں کھلتا ہوا دروازہ ہے جہاں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ان کی زندگی کی کہانی بھی ہے اور اس ساری تحریر میں اُن کی اپنی اُفتادِ طبع کی روانی بھی ہے۔ سہیل پروآز کے احباب جانتے ہیں کہ وہ ایک اُجلی طبیعت کے مالک ہیں اور بے تکلفانہ طرزِ احساس رکھتے ہیں، یہی جولانیٔ طبع اُن کی اس تحریر میں کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ کتاب کا موضوع دلچسپ اور اہم ہے۔ خانگی اور ازدواجی زندگی

کے پس منظر میں ایک پوری کتاب کا تجربہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے، تاہم ''جو تنہا کر گئی مجھ کو'' اپنی نوعیت کی ایسی کتاب ہے جس میں مصنف نے لفظوں کے ذریعے اپنی شریکِ حیات کے ساتھ بیتے ہوئے 39 برسوں کی فلم بنا کر نذرِ قارئین کی ہے جس میں جزئیات نگاری بھی ہے، مقدس رشتوں کے احترام زاہالے بھی بُنے گئے ہیں اور ماں اور بیٹے کے رشتے کے حوالے سے جذبات نگاری بھی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنی شریکِ زندگی کو مرکز بنایا ہے اور ایک خاندانی آپ بیتی کو جگ بیتی کی طرح پیش کیا ہے۔ سہیل کی قلمی جہات میں شاعری، نظم نگاری، ٹی وی ڈرامے، اُردو اور انگریزی اخباروں میں کالم نگاری، بچوں کے لیے ڈرامے اور انگریزی ناول شامل ہیں۔ اس کتاب میں اظہار کے یہ سارے رنگ جھلکتے ہیں۔ وہ صاحبِ مطالعہ ہیں اور تاریخ کے دریچے بھی اپنی سمت وا رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے سماجی و معاشرتی سطح پر اُن کے ہاں تقابلی تجزیے کا رنگ بھی ملتا ہے۔

یہ کتاب سہیل پرواز کی زندگی کا نچوڑ ہے۔ اس میں نوجوانوں، طالبعلموں اور ازدواجی زندگی میں داخل ہونے والے نئے لوگوں کے لیے ایک تجربہ بھی ہے اور ایک مکمل پیغام بھی۔ میں سہیل پرواز کو اِس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید
(پرائڈ آف پرفارمینس)
مینیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد

☆ ☆ ☆

کیہہ جاناں میں کون؟

حضرت علی کرم اللہ وجہ کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے بزرگوں نجرت شاہ، درّاب شاہ، قرطاس شاہ اور قطب شاہ وغیرہ نے افغانستان کی دھرتی پر دین کی تعلیم کو عام کیا تاوقتیکہ حافظ خیر محمد نے کوئی اڑہائی سو سال قبل سلسلۂ تبلیغ کو مزید وسعت دینے کیلئے صوبہ سرحد میں پڑاؤ ڈالے۔ یہیں مولانا محمد حسین نے جنم لیا اور پھر میرے والد اور انکے فرزند الطاف پرواز نے آٹھ بہنوں کے بعد آنکھ کھولی۔ میرے نصیب میں شاعر و ادیب الطاف پرواز اور تحریک پاکستان کی طالبعلم رہنما اور پنجاب سیکریٹریٹ پر پرچم لہرانے والے دستے کی روح رواں نسیم الطاف کے گھر میں آنکھ کھولنا لکھا تھا جو والد مرحوم کی ہجرت سے ہی ممکن ہوا اور یوں میری جنم بھومی ضلع ہزارہ کا موضع درویش نہیں بلکہ اندرون بھاٹی گیٹ، نور محلہ لاہور ٹھہری۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ جونیئر ماڈل سکول لاہور اور پھر سر سید سکول مال روڈ راولپنڈی سے حاصل کی لیکن میٹرک ڈ مسلم ہائی سکول نمبر ا پنڈی سے اور انٹرمیڈیٹ گورنمنٹ کالج اصغر مال روڈ، راولپنڈی سے کیا۔ تعلیمی رجحان واجبی رہا گو کہ خاندان کے بزرگوں کو ہمیشہ خوش فہمی رہی کہ میں بہت ذہین ہوں۔ پڑھائی سے فرار حاصل کر کے ملٹری اکیڈیمی کاکول میں پناہ حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی لیکن افسوس کہ یہ سعی کھجور میں اٹکنے کی سی ثابت ہوئی۔ چوبیس سالہ ملازمت کے دوران فوج اور میں ایک دوسرے کا کچھ نہ بگاڑ سکے چنانچہ میجر کے چاند تارے پر اکتفا کرتے ہوئے

آئی ایس پی آر میں تعیناتی کے دوران 'رِکٹ جمع' کرادی اور سول زندگی کے نشیب و فراز کا مشاہدہ کرنے نکل پڑا۔ حالات و واقعات کے جوار بھاٹوں کے جھٹکوں کے بعد خاندانی پیشہ ادب و صحافت میں طبع آزمائی شروع کی۔ اسی دوران حادثاتی طور پر ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کی ڈگری تو حاصل کر لی مگر آج تک یہ نہیں جان پایا کہ دھکا کس نے دیا تھا۔ مختلف قومی اردو انگریزی روزناموں میں دونوں زبانوں میں ایک عشرے سے زیادہ عرصہ تک 'پانچواں کالم' اور 'ٹریک تھری' باقاعدگی سے تحریر کیا۔ اب بھی ایک انگریزی روزنامے کیلئے کالم تحریر کر رہا ہوں۔ ڈرامہ اور ڈاکومنٹری پسندیدہ اصناف ہیں۔ پی ٹی وی کیلئے ڈرامہ سیریز نرس اور بچوں کا معلوماتی تفریحی کھیل ''گھومو پھرو مزے اڑاؤ'' قابلِ ذکر ہیں۔ بہت سی ڈاکومنٹریاں انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں جن میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والی پہلی پاکستانی خاتون ثمینہ بیگ پر بنی فلم Beyond the Hieghts اہم ہے جسے اسپین کے فلمی میلے میں پذیرائی ملی۔ ٹوئیٹر اور فیس بک پر موجودگی کا مقصد محض وقت کا زیاں نہیں بلکہ جواں نسل سے دوستی ہے جو پاکستان کے مستقبل کے معمار ہیں۔ اپنے تئیں انکی رہنمائی کرنے کی پوری کوشش کرتا ہوں کہ اس کو اپنی نسل کے لوگوں پر ایک قرض سمجھتا ہوں۔ پاکستان کے موجودہ حالات سے متعلق میرا انگریزی ناول The Cornered Rogue ۲۰۱۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ زندگی کے بارے میں میرا فلسفہ ہے کہ جب تک آپ زندہ ہیں آپ مقابلے میں ہیں اور جب تک مقابلہ جاری ہے امید بھی باقی رہنی چاہیئے۔ اسلام اور پاکستان میری شناخت ہیں۔ پلے کچھ نہیں لیکن روزِ محشر خاتم الانبیاءﷺ کی شفاعت کا شدت سے متمنی ہوں۔ اردو میں میری اگلی تصنیف ان شاٗ اللہ آٹھ سے ساٹھ سال کے بچوں کیلئے دین اور وطن سے محبت پر مبنی سنسنی خیز سائنس فکشن ناول ہوگا۔

شہیل پرواز

jo.tanhaa.ker.gayi@gmail.com

☆ ☆ ☆

چلتے، چلتے

کیا دکھوں کو ہنستے مسکراتے سہنا جرم ہے؟
ہرگز نہیں
ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مسکرانے والوں کیساتھ تو سب مسکراتے ہیں لیکن رنجیدہ ہونے والوں کو تنہا رونا پڑتا ہے۔ سر چارلی چیپلن کا ایک قول مجھے بیحد پسند ہے کہ، "مجھے بارش میں چلنا بیحد پسند ہے کیوں کہ میرے آنسو کسی کو نظر نہیں آتے"۔ دکھ ہر انسان کا ذاتی سرمایہ ہے۔ میں نے اگر اپنی رفاقت کی داستان قارئین کے ساتھ شیئر کی ہے تو فقط اسلئے کہ اس میں جوان نسل کیلئے سبق پنہاں ہے ورگرنہ بہت کم لکھاری اپنی نجی زندگی کے دریچے وا کرتے ہیں۔ میرے قارئین اور مداحوں کو میری سنجیدہ تصویریں کبھی بھی پسند نہیں آئیں۔ انکی خواہش ہوتی ہے کہ میں فیس بک پر بھی مسکراتی تصاویر لگایا کروں۔ بیشک میری ۳۹
قت کی داستان آپکے لئے، لیکن جو تنہا کر گئی مجھ کو......! اس کا غم صرف اور صرف میرا ہے۔ میری
سی فلسفے کی تشریح کرتی ہے۔
سمجھ لیجیئے کہ مجھے بارش میں چلنا اچھا لگتا ہے۔

www.sangemee
ISBN-10 969-35-3
ISBN-13 978-969-35-
9789693530582